اصولِ تحقیق و ترتیبِ متن

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

سنگت پبلشرز لاہور

Scanned with CamScanner

متن اور روایتِ متن

متن Text کسی ایسی عبارت "تحریر" یا نقوش تحریر کو کہتے ہیں جن کی قرأت یا معنوی تفہیم ممکن ہو۔ لغوی طور ٹیکسٹ یا متن کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ مصنف کے اصل الفاظ، کتاب کی اصل عبارت (شرح وغیرہ سے قطع نظر کرکے) (۲) کتاب الٰہی (انجیل (و قرآن) وغیرہ کی آیت یا آیات جو کسی وعظ یا مقالے کے موضوع یا سند کے طور پر استعمال کی جائیں (۳) متن کتاب کا مضمون۔ (حواشی تصاویر وغیرہ سے قطع نظر کرکے)۔ (۴) جلی خط۔ نصاب کی کتاب۔ درسی کتاب (Standard Urdu English Dictionary)[1]

ان میں سے بنیادی اہمیت خط کشیدہ جملوں کی ہے۔ باقی متن کی مختلف نوعیتوں سے تعلق رکھنے والی کچھ وضاحتیں ہیں جو اس سلسلے کی تنوع مباحث کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

پروفیسر ایس۔ ایم کاترے نے اپنی کتاب (Textual Criticism) میں متن کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

By a text we understand a document written in a language known more or less to the inquirer and assumed to have a meaning which has been or can be ascertained. Since a text implies a written document. The knowledge

---

[1] اسٹینڈرڈ اردو انگلش ڈکشنری: ۱۲۰۸

of writing has to be pre sumed the basis of
our study.

Introduction to Indian
Textual Criticism :
By : Prof. S.M. Katre—Page-27

مختلف متنوں کے درمیان تقسیم منقول و معقول کے اعتبار سے بھی ہو سکتی ہے وسائل تحفظ کے اعتبار سے بھی رسم تحریر و املا نیز زبان و بیان کو بھی متن کے درجات کے تعین (Gradation of Tex) میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ بریں تالیفی نوعیت کے لحاظ سے بھی مختلف متون کی درجہ بندی ممکن ہے۔ یہ سب اضافی صورتیں ہیں مگر کسی متن پر تنقیدی و تحقیقی گفتگو میں یہ امور اپنے مختص پہلوؤں کے ساتھ سامنے آسکتے ہیں۔ مثلاً کتب سماوی پر ایسی کسی بحث میں ان کے متن کی الوہی یا الہامی نوعیت کو بہر حال پیش نظر رکھنا ہوگا۔ منقوش عبارتیں جو پتھر کی سلوں، دھات کے پتروں، پکی مٹی کی لوحوں یا ہاتھی دانت وغیرہ کے ٹکڑوں پر ملتی ہیں وہ اگر شکست و ریخت کے عمل سے بچ گئی ہوں تو ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ اصل صورت میں ہیں اور جو کچھ یہاں لکھا ہوا ہے وہ Original حالت کی نشان دہی کرتا ہے لیکن نسبتاً کم دیرپا وسایل حفظ تحریر کے بارے میں یہی بات اتنے وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔

فضا و موسم کے اثرات کے علاوہ انسانی ارادے سے بھی متن کے اجزا و علامات میں تبدیلیاں آجانے کا امکان رہتا ہے۔ خط اور املا کا مصنف کے زمانے اور ذہن سے بہت گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ بہت سی تحریروں کے زمانے کا فیصلہ بہت کچھ انھیں امور کے سہارے کیا جانا ممکن ہے۔ متن کی تالیفی نوعیت کو بھی متن کے مسایل سے الگ کر کے دیکھنا مشکل ہے۔ بعض متن ایک سے زیادہ زبانوں میں ترتیب دیے جاتے ہیں بعض ایک سے زیادہ علوم اور ہیئتوں کی پابندی کے ساتھ موضوع گفتگو بنتے ہیں اور کچھ عبارتیں یا متون ایسے ہوتے ہیں جن کے الفاظ اپنی مختلف جہتوں کے ساتھ اپنے معانی کے اعتبار سے مختلف الموضوع ہو جاتے ہیں ——— بعض تصانیف میں متن کے

Scanned with CamScanner

ساتھ تشریحی اور توضیحی انداز کی عبارتیں بھی شامل ہوتی ہیں کبھی وہ خود صاحب متن کی نگارشات ہوتی ہیں اور کبھی بعد کے اضافی نگارشوں کا درجہ رکھتی ہیں لیکن متن کے استناد اور روایت متن کے تعین سے ان کا گہرا واسطہ ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ مصنف کے اپنے یا اس کے قریبی دور کے تعلیقے بھی اضافی حیثیت میں سامنے آنے کے باوصف اپنی تحقیقی اہمیت کے اعتبار سے کبھی متن کے لئے ایک جزو لاینفک بن جاتے ہیں۔

بنا بریں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ بعض اوقات متن دو حصّوں میں تقسیم ہوتا ہے "اصل متن" اور "اضافی متن"۔

کچھ "املائی متن" ہوتے ہیں ایک شخص بولتا جاتا ہے اور دوسرا لکھتا جاتا ہے اب اگر وہ جو کچھ سنتا ہے وہی لکھتا بھی جاتا ہے تو اسے "تقلیدی متن" کہنا زیادہ مناسب ہے اور اگر اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق وہ املا کیے ہوئے متن میں الفاظ کو پس و پیش اور مضمون کو کم و بیش کر رہا ہے تو وہ املائی متن نہ رہ کر "نیم تقلیدی متن" ہو جائے گا۔ یہ صورت کبھی مصنف کی کسی معذوری کے باعث پیش آتی ہے اور کبھی متن کو براہ راست ترجمہ یا ترجمانی کی شکل میں کسی دوسری زبان میں پیش کیا جاتا ہے اور مصنف اس سعی میں شریک ہوتا ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد کی کتاب India Wins Freedom اسی نوعیت کی تصنیف ہے جسے پروفیسر ہمایوں کبیر نے ترتیب دیا ہے۔ اوّل الذکر تالیفی صورتوں کی مثالیں ملفوظات کی شکل میں ملتی ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک دوسری نوعیت کی مثال عجائب القصص مصنفہ شاہ عالم ثانی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

بعض متون "سماعی متن" ہوتے ہیں اور کبھی کبھی صدیوں تک سینہ بہ سینہ اور زبان بہ زبان ہوتے ہوئے تحریری شکل میں سامنے آتے ہیں۔ "آلہا اودل" اس کی ایک معروف مثال ہے۔ عام طور پر جو متن ملتے ہیں وہ ایک شخص کی سعی تحریر و تالیف سے نسبت رکھتے ہیں لیکن کچھ ایسے متون بھی ہیں جو بہت سے معلوم و نامعلوم افراد کی تالیف یا تخلیق ہیں اور جن کا زمانہ بھی ایک طویل عرصہ پر پھیلا ہوا ہوتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ عرصہ قرنوں اور صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔ لوک ساہتہ Folk Literature بالعموم اسی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اہل ہند کی بعض قدیم کتابیں اسی صورت حال کی عظیم

مثالیں ہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر کاترے نے لکھا ہے :

When we deal with texts we have to conside two different possibilities ; as in the case of early Indian literature produced not as much by individual authors as by definite schools and transmitted orally, the reduction to writing must have taken place at different centres of learing of culture at different periods

Between this reduction to writing and the actual composition of the text a lies number of generation of reciters and scholars who have left their impression on the text as a whole. Thus we shall not be in a position to cite any particular copy as the original text.

ایسے متون میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ و ترمیم کا عمل بھی جاری رہتا ہے اور اصل و فرع میں بہت کچھ فرق ہو جاتا ہے۔ ایسی شکلوں میں Basic Text قدیم تر قلمی نسخہ ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسے کسی متن میں وہ باقاعدگی ترتیب اور انضباطی کیفیت مشکل ہی سے مل سکتی ہے جو انفرادی طور پر ترتیب دیے ہوئے متون کی ایک خصوصیت ہوتی ہے۔

قدیم مشرقی و مغربی زبانوں کا کلاسیکی لٹریچر زیادہ تر مخطوطات کی صورت میں ملتا ہے اور انہی قلمی نسخوں کی مدد سے اس کی ہیئت اور حدود تک رسائی ممکن ہے۔ بعض

Scanned with CamScanner

متن اب اپنی اصلی شکل میں نہیں ملتے، بعض کی زبان بدل گئی ہے اور بعض کا رسم الخط۔ اس لئے ان کی اصل صورت اور حدود و مشتملات کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ اس نوع کے کسی متن کی قدیم تر معلوم و منضبط روایت ہی کو اس کی ممکن الحصول شکل قرار دیا جاسکتا ہے جو زمانی اعتبار سے اپنی اصل سے نسبتاً قریب تر ہو۔

مصادر کے لحاظ سے بھی متن مختلف الحیثیت ہوتے ہیں۔ بعض متون کی قلمی یا مطبوعہ صورت میں صرف ایک ہی روایت دستیاب ہوتی ہے بعض کے متعدد قلمی نسخے ملتے ہیں اور کئی بار یہ کثیر التعداد ہوتے ہیں۔

بعض متون کے قلمی نسخے مختلف خطوط Scripts میں ملتے ہیں مثال کے طور پر اودھی بھاشا کے ایسے بہت سے عشقیہ ناموں یا پریم کتھاؤں کا ذکر کیا جاسکتا ہے جن کے پرانے نسخوں میں کچھ فارسی رسم الخط میں ہیں اور کچھ ہندی دیوناگری لپی میں۔

معلومہ قلمی نسخوں میں سب سے اہم وہ قلمی نسخے ہو سکتے ہیں جو خود مولف کے اپنے دست و قلم کے مرہونِ منت ہوں اور جن کے بارے میں اس امر کی کافی وشافی شہادت (داخلی یا خارجی سطح پر) موجود ہو کہ یہ صاحب تصنیف کا اپنا خطی نسخہ ہے۔ ایسے کسی نسخے یا نسخوں میں موجود متن کو "اساسی متن" قرار دیا جانا چاہئے۔ دوسرے درجے پر ایسے قلمی نسخے آسکتے ہیں جو مصنف کی نظر سے گزر چکے ہوں۔ اس کا فیصلہ نہایت احتیاط کے ساتھ کیا جانا چاہئے کہ واقعتاً کوئی نسخہ مصنف کی نظر سے گزرا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں بطور خاص وہ نسخے رکھے جاسکتے ہیں جو مصنف کے ایما سے بڑے اہتمام کے ساتھ تیار کیے گئے ہوں یا جن کی تیاری میں اس کے کسی عزیز شاگرد، مرید یا دوست کا ہاتھ رہا ہو۔ ایسے کسی متن کو فرق مراتب کے ساتھ "استنادی متن" کہہ سکتے ہیں۔ (ایسے ہی کچھ نسخوں میں وہ مطبوعہ نسخے بھی شامل کئے جاسکتے ہیں جن کے اصل مخطوطے بصورت عکس ان کے ساتھ موجود ہوں) اس کے مقابلے میں دوسرے ایسے قلمی نسخوں کے متن کو جنھیں مستند قرار دیا جائے استشہادی متن کہنا مناسب ہوگا۔

مطبوعہ نسخوں میں بھی قدیم و جدید اور درجہ استناد کے اعتبار سے اہم اور غیر اہم کا فیصلہ انہیں اور ایسے ہی کچھ باوثوق شواہد کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے۔ جن متون

کی کتابت شدہ روایت اور پروف کاپیوں کی تصحیح خود مصنف نے کی ہو اسے مطبوعہ روایتوں میں اساسی متن کا درجہ دیا جانا چاہیے۔

لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس بارہ خاص میں ضروری چھان بین، اگر کسی وسیلے سے ممکن ہو، تو ضرور کر لی جائے۔ اس لئے کہ ضروری نہیں کہ مطبع کے کارپردازوں نے بھی مصنف کی اصلاح دادہ روایتوں کو پوری احتیاط کے ساتھ درست کر دیا ہو۔ اس کے ساتھ مطبوعہ روایتوں میں ان روایتوں کی اہمیت زیادہ ہوگی جو صاحب متن کے قریب تر افراد یا زمانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ ان کو مطبوعہ سطح پر "استنادی روایت" قرار دیا جانا چاہیے۔ اس کے مقابلے میں مطبوعہ شکل میں نسبتاً زیادہ معتبر متن کو "استشہادی روایت" کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

متن کی مختلف جہتوں اور نوعی صورتوں کا احصار مشکل ہے ہر متن ایک مستقل وجود ہے اور اپنی مختلف روایتوں کی شکل میں اپنے ایک سے زیادہ ذیلی و ظلی وجود رکھتا ہے۔ اس طلسم خانے میں اُتر کر متون کی صحیح ہیئت اور حدود روایت کا تعین ایک نہایت اہم مشکل مگر نتیجہ خیز کام ہے۔ جس کے لئے غیر معمولی سطح پر ذہنی کاوش اور اہتمام تلاش جزئیات ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کسی متن کی تصحیح اور ترتیب کا مسئلہ اصول تحقیق و تنقید کے بنیادی مسائل میں سے ہے۔ اس کے بغیر نہ تحقیق کا قدم آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ تنقید کو صحیح جہت میسر آسکتی ہے۔ اس لئے کہ تحقیق اور تنقید کی اساس بہرحال ان متون پر ہے جن سے حقائق کے تجسس مسائل کی تفہیم اور معیاروں کے تعین میں مدد لی جاتی ہے۔ اب اگر یہ متنی وسائل ہی باوثوق سطح پر قابل استناد نہ ہوں تو اخذ نتائج کے عمل کو کیسے مبنی پر حقیقت قرار دیا جا سکتا ہے۔

روایتیں تقریری بھی ہو سکتی ہیں اور تحریری بھی۔ دونوں صورتوں میں یہ جاننا اور اس امر کا امکانی تفحص کرنا ضروری ہے کہ روایت کو نقل کرنے والا شخص کوئی معتبر آدمی ہے یا نہیں۔ اور اگر کسی روایت کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے تو بڑھ کر کن واسطوں سے کہاں تک پہنچتا ہے اور جو وسائل یا واسطے درمیان میں آتے ہیں انہیں صحت بیان یا نقل روایت کے اعتبار سے کیا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ان میں کوئی ایسا شخص یا روایت نگار تو نہیں ہے جس کی قوت تفہیم یا نگارش قلم پر پوری طرح بھروسہ نہ کیا جا سکے

یا جسے بات کو اس کے اپنے انداز میں کہنے کے بجائے خود اپنے رنگ میں پیش کرنے کا شوق ہو، یا پھر جس کی قوتِ حافظہ پر اعتماد نہ کیا جاسکے۔ جس کا قلم لغزشوں سے محفوظ نہ ہو یا جو زبان کی نزاکتوں سے عدم واقفیت اور اسلوب تحریر کی کشش و دروش سے مناسبت نہ ہونے کے سبب سے غلطیاں کرسکتا ہو۔ غرض امکانی سطح پر تجسس و تحقیق کے بعد ہی روایت کی صحت و عدم صحت کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

زبانی تقریر کے مقابلے میں تحریر روایت کی اصل صورت کے تحفظ کا ایک بڑا ذریعہ ہے لیکن یکے بعد دیگرے نقل روایت کی صورت میں جب الفاظ و عبارات زبان خامہ سے گزرتے ہیں تو صاحب تحریر کی ذہنی روش اور نفسیاتی حالتوں کے باعث جانے ان جانے طریقوں سے ان میں بہت سی تبدیلیاں راہ پاجاتی ہیں۔ مختلف زبانوں میں ایسے بے شمار متون ملتے ہیں جن میں گوناگوں اختلافات موجود ہیں۔

یہ اختلافات ہر سطح اور ہر موقع پر یکساں طور سے اہم نہیں ہوتے، اپنی نوعیت اور اساس کے اعتبار سے کہیں غیر معمولی اور بہت اہم ہوتے ہیں اور کہیں غیر اہم، کہیں حقیقت سے ان کا رشتہ قریب کا ہوتا ہے اور کہیں بہت دور کا اور ایسے بھی کچھ اختلافات ہوسکتے ہیں جن کو تحقیق و تنقید کے معیار سے درخور اعتنا بھی قرار نہ دیا جاسکے۔

(کسی روایت کی تسوید کے وقت تو ہر مصنف اپنی عبارتوں یا کسی عبارت کے مختلف اجزا میں تبدیلیاں کرتا ہے لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ابتدائی یا ثانوی روایت کی تکمیل اور مبیضہ کی تیاری کے بعد بھی صاحب تصنیف اس میں نئی معلومات کی روشنی یا ذہن کے نئے طریق رسائی کے مطابق تبدیلی کرتا ہے اور گاہ گاہ ایک زمانے تک اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے جس کے باعث اس کی مختلف روایتوں میں اختلاف نسخ پیدا ہوجاتا ہے اور کبھی جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا نقل روایت کے وقت یہ تبدیلیاں کہیں عبارت اور کہیں اجزائے عبارت میں در آتی ہیں، جو اختلاف روایت کا سبب بنتی ہیں۔ زمان و مکان کا اختلاف بھی بیشتر اس کے پس منظر میں موجود ہوتا ہے جو لفظ و معنی اور املا و تلفظ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بنیادی رسم خط (Original Sript) کی تبدیلی بھی اس کے موجبات میں ہوسکتی ہے۔)

(اس ضمن میں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کیا جانا چاہئے کہ کبھی خود مصنف بھی

اضطراری یا غیر ارادی طور پر کچھ سے کچھ لکھ جاتا ہے جو اس کا مقصد نہیں ہوتا یہی صورت کاتب کے ساتھ بھی پیش آسکتی ہے۔

نظر ثانی میں ایسی فروگزاشتوں کی بالعموم تصحیح ہو جاتی ہے لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ نظر ثانی کی نوبت ہی نہیں آتی یا پھر طائرانہ نظر اور سہو فکر کے باعث ان تبدیلیوں پر جو نامعلوم اور غیر محسوس طور سے ہو جاتی ہیں نظر بھی نہیں جاتی اور یہ صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔

کہیں ان کی نوعیت نسخہ بدل کی سی ہوتی ہے اور کہیں یہ "خامۂ غلط نگار" کی روش کا "رہ آورد" ہوتی ہیں۔ کبھی املائی صورتوں کی مشابہت اس کا سبب بنتی ہے کبھی متوازی ہیئت یا لفظ کی معنوی مناسبت ذہن کو اس طرف مائل کرتی ہے۔ کبھی لاعلمی، تساہل اور کم نظری کے سبب سے ایسا ہوتا ہے اور کبھی دیدہ و دانستہ عبارت میں قطع و برید کر کے اپنے خاص عقیدے خیال اور مقصد کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ کبھی اس طرح کی کوئی تبدیلی عوام کی زبان پر جاری و ساری متن میں نامعلوم طور پر ہو جاتی ہے۔ کبھی غلطی خود روایت نگار کرتا ہے اور کبھی وہ کسی دوسری روایت یا نسخے سے ماخوذ ہوتی ہے جس کے باعث یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ہی قسم کی تبدیلی یا غلطی ایک سے زیادہ روایتوں میں ملتی ہے۔ نسخوں کے "شجراتی سلسلے"[1] میں ان امور کی بہت اہمیت ہے۔

مختلف النوع متنی تبدیلیوں کو ان کی سببی نوعیت کے پیش نظر کئی شقوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

ترمیم: نامعلوم اسباب کے تحت ہونے والی تبدیلیاں جن میں سہو نظر اور لغزش قلم

---

[1] مختلف روایتیں اپنی باہمی مناسبتوں اور مماثلتوں یا اختلافی نوعیتوں کے باعث ایک دوسرے سے بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر وابستہ ہوتی ہیں اور کبھی ایک روایت کا کاتب یا نقل بردار اس کا واضح طور پر اظہار کر دیتا ہے کہ اس کی موجودہ روایت فلاں روایت سے منقول ہے۔ یہ سلسلہ ایک سے زیادہ روایتوں تک جا سکتا ہے۔ کبھی یہ سلسلہ روایت خارجی شواہد کی بنا پر قائم نہیں ہوتا بلکہ داخلی شہادتیں اس کی طرف ذہن کو مائل کرتی ہیں۔ زمانی تقدیم و تاخیر کے ساتھ آنے والی روایتیں ایسے سلسلوں میں اصل و فرع کو ظاہر کرتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

کو بھی داخل سمجھنا چاہیے۔ [یہ ارادی ہو سکتی ہے اور غیر ارادی بھی]

تعبیر: جس میں مبہم لفظ کی وضاحت کے لیے کسی عبارت کو بڑھایا گیا ہو۔

تنسیخ: جس میں جان بوجھ کر کسی متن یا اجزائے متن کو منسوخ کیا گیا ہو۔

تصحیح: صاحب متن نے خود اپنی خواہش اور مقصد کے مطابق عبارت میں کوئی تبدیلی کی ہو۔

تصحیف: صاحب متن کے علاوہ کسی دوسرے شخص نے متن یا اجزائے متن میں دانستہ کوئی تبدیلی کی ہو۔

غلط انتساب ایک دوسری صورت ہے جس کے اپنے کچھ اسباب و وجوہ ہو سکتے ہیں۔ کبھی یہ خواہش اور ارادے کے تحت ہوتا ہے اور اپنی تصنیف از راہِ عقیدت و خلوص دوسرے کے نام کر دی جاتی ہے اور کبھی نقل بردار کی لاعلمی خیالات کی یکسانیت بحور و اوزان کی یکرنگی اس کا سبب بن جاتی ہے۔ کبھی مختلف تصانیف کی ہم رشتگی کے باعث ایسا ہوتا ہے۔ کبھی مصنفین یا کتابوں کے ناموں کی مشابہت اس کا موجب بن جاتی ہے اور کبھی اس سلسلے میں کچھ خاص مقاصد و مرادات کے زیر اثر نوبت جعل و دغل تک پہنچ جاتی ہے۔

یہ صورت حال ہو یا وہ صورت حال متنی حقائق کی جستجو کی طرف بہر نوع ذہن کو مائل کرتی ہے اور اس کا مقصد متن کی صحیح حدود اور روایتوں کا تعین ہے خواہ وہ متن طویل الذکر ہو یا مختصر۔

اس کا فیصلہ کرنے کے لئے متن میں کہاں کس نوعیت کی غلطی موجود ہے غیر معمولی قوت استقرا اور خوے احتیاط کی ضرورت ہے (اس لیے کہ بعض اوقات ایسے مسائل میں تصفیے کے وقت ایک شخص خود اپنے ذہن کے پیچ و پیچاک اور فکر و نظر کی بھول بھلیوں کا بھی شکار ہو سکتا ہے) گہری چھان بین، تقابلی مطالعہ اور بالاستعیاب نظر داری کو بھی اس کے لیے ایک ناگزیر صورت سمجھنا چاہیئے جس کے بغیر کسی صحیح نتیجہ تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا۔ ترتیب متن کا اساسی مقصد ہی عبارت کی صحیح قرأت کا تعین اجزائے عبارت کی صحیح ترتیب اور اس کے وسیلے سے کسی روایت کو اس کی صحیح شکل میں پیش کرنا ہے۔ اس میں اس کی زبان اس کے ترکیبی اجزاء اور اس کا املا سبھی باتیں شامل ہیں۔ قدیم متون کی صورت میں الفاظ کے قدیم املا کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں بھی مصنف کا

Scanned with CamScanner

اپنا املا مرجح حیثیت رکھتا ہے۔ یہ املا متن کی صوری ہیئت کا ایک لازمی جز ہوتا ہے۔
کسی متن کی اصل اور صحیح صورت وہی ہو سکتی ہے جس کے ساتھ خود صاحب متن نے اسے پیش کیا ہو اپنی اصل شکل میں مصنف کا اپنا مسودہ یا مبیضہ اگر مل جائے اور باوثوق سطح پر اس کے بارے میں یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ یہ صحیح ہے تو اسی روایت کو اصل متن قرار دیا جانا چاہیے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصنف کے قلم سے اس کی ایک سے زیادہ روایتیں موجود ہوں۔ ایسی صورت میں بالعموم آخری روایت کو مستند روایت کا درجہ دیا جاتا ہے لیکن تخلیقی متون میں جہاں زبان املا اور تلفظ کے بہت سے مسائل متن سے وابستہ ہوتے ہیں وہاں اوّلین متن کو اساسی روایت قرار دینا اور موخر روایات کو اضافی حیثیت سے شامل کرنا زیادہ بہتر صورت ہو سکتی ہے جیسا کہ اس سے بیشتر بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔ خطی نسخے یا نسخوں کی عدم موجودگی میں استنادی اور استشہادی متون کو ان کی جگہ رکھا جا سکتا ہے۔ یہ ہی بات مختلف مطبوعہ نسخوں کے سلسلے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔
روایت کے ایک سے زیادہ قلمی اور مطبوعہ ماخذ موجود ہوں اور ان کے زمانۂ تحریر کا تعین داخلی اور عارجی شہادتوں کی مدد سے ممکن ہو تو Gradation of Text کے اصول پر ان کے درجہ استناد کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ تصحیح متن کا کام قدیم قلمی یا مطبوعہ نسخوں کی مدد سے ان کے تقابلی مطالعے کی روشنی میں کیا جانا چاہیے۔ اس کے لیے مصنف یا مصنف کے زمانے کے رسم خط زبان املا اور تلفظ کی صورتوں سے علمی سطح پر واقفیت ضروری ہے۔ اس زمانے کے لغات اور فرہنگوں سے بھی حسب ضرورت استفادہ کیا جا سکتا ہے۔
ترتیب متن کا کام سائنسی نہ ہوتے ہوئے بھی ایک سائنسی طریق کار کا تقاضا کرتا ہے اس کے لیے ذہنی تربیت کی ضرورت ہے جو لوگ اہتمام تلاش جزئیات نہ کر سکیں اور جن کی طبیعت مسلسل محنت ذہنی کاوش اور دیدہ ریزی پر آمادہ نہ ہو انھیں اس کام سے دل چسپی کا اظہار نہ کرنا چاہیے۔
اردو میں ترتیب متن کے کام پر اب تقریباً ایک صدی بیت رہی ہے۔ جس میں ہر نوع کے نمونے سامنے آئے ہیں۔ کچھ قلمی نسخے بہت سلیقے سے مرتب ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر حافظ محمود شیرانی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، اور پروفیسر مسعود حسن رضوی وغیرہ اکابر کے مرتبہ بعض متنوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ترتیب متن کی ایک دل چسپ مثال

مولانا محمد حسین آزاد کا دیوان ذوق بھی ہے۔ لیکن ایسے کچھ نسخوں کے مقابلے میں بڑی تعداد ایسے متنوں کی ہے جن کی ترتیب میں متن اور ترتیب متن کی بنیادی شرائط کو تقریباً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ قدیم مخطوطوں اور نایاب قلمی نسخوں کو ان کی اصل شکل میں چھاپ دینا بھی بڑی بات ہے لیکن اس "عمل خیر" سے ترتیب متن کے تقاضے پورے نہیں ہوتے اور متن کے بارے میں (ذہن کی سطح پر ابھرنے والے) بہت سے امور تحقیق و تنقید کی روشنی سے محروم رہتے ہیں۔

جہاں تک اصول تحقیق و ترتیب متن کا سوال ہے اب تک اس موضوع پر قاضی عبدالودود، ڈاکٹر نذیر احمد اور رشید حسن خاں جیسے اہل تحقیق کے مضامین کے علاوہ ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب "متنی تنقید" بھی سامنے آچکی ہے۔ ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے بھی تدوین متن پر مضامین لکھے ہیں۔ ان حضرات کی توجہ دہی کی بدولت اب اس موضوع کی اہمیت اور اس ضمن میں کارکردگی کی ضرورت کو محسوس کیا جا رہا ہے جس کے باعث یہ موضوع زیادہ توجہ، تحقیقی مطالعے اور تنقیدی کاوش کا تقاضا سنجیدہ نظر آتا ہے۔ یہی ذہنی تقاضا راقم الحروف کی اس علمی کاوش کا محرک ہے۔

علاوہ بریں سالہا سال تک ترتیب متن کے کام میں مشغول رہنے اور اس سلسلے میں گوناگوں مشکلات سے گذرنے کے باعث بہت سے مسائل میرے سامنے آئے ہیں اور اپنی معمولی صلاحیت کے مطابق میں نے ان پر غور و فکر کیا ہے اس کے نتائج آئندہ آنے والے صفحات میں موجود ہیں۔ میں نے جو اصول و ضوابط وضع کیے ہیں وہ بہت کچھ میرے ذاتی مطالعے اور تجربے کا حصہ ہیں۔ اس میں بیشتر اچھے تحقیقی اور تدوینی نوعیت کے کاموں کے علاوہ قدیم مخطوطوں اور مطبوعہ نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے اور مختلف مواقع پر ادبی ماخذ کے علاوہ غیر ادبی ماخذ کو بھی سامنے رکھا گیا ہے۔ بایں ہمہ اخذ نتائج اور استنباط نظائر کے لیے جگہ جگہ قوت استقرار کا سہارا بھی لیا گیا ہے جو اس سلسلۂ کار کی ایک مجبوری تھی۔ بعض انگریزی کتابوں سے بھی رجوع کیا گیا مگر ان سے کوئی بڑا فائدہ اٹھانے کی نوبت نہیں آئی۔ اس میں میری کم نظری کو بھی دخل ہو سکتا ہے۔

یہ مقالہ اپنی موجودہ صورت میں اردو زبان میں اس موضوع پر یہ پہلا مبسوط کام ہے جس کے لیے بہت سی اصطلاحیں بھی راقم الحروف کو وضع کرنی پڑی ہیں۔ اسی کے ساتھ بعض اصطلاحوں کو ان کی نئی تعبیر کے ساتھ پیش کیا گیا۔ یہ سب کس حد تک صحیح یا غلط ہے نیز اس کام

Scanned with CamScanner

کی انجام دہی میں مجھے کس قدر کامیابی ہوئی ہے، اس کا فیصلہ اہلِ علم ہی کر سکیں گے۔ خاص طور پر وہ افراد جو اس کام کو زیادہ صحیح سمت کے تعین کے ساتھ آگے بڑھائیں گے۔

ترتیبِ متن کے کام کو میں نے جس طور پر سمجھا ہے اور خود اسے جن ابواب میں تقسیم کیا ہے اس کا مطالعہ آئندہ اوراق میں کیا جا سکتا ہے۔

تالیفِ متن

تالیف متن سے مراد مآخذ کی جستجو اور معیار بندی ہے جس کے لیے وسائل و مصادر کی طرف رجوع ایک ناگزیر صورت ہے۔

اسی لیے کسی متن کو تحقیقی طور پر مرتب کرنے کے لیے سب سے پہلا اور ضروری کام ایسے ماخذ کی جستجو اور اسانید کی دریافت ہے جن پر اس متن کی اساس قائم کی جا سکے اور جن کی مدد سے اس سے متعلق دوسرے ضروری مسائل کی تحقیق اور توجیہہ ممکن ہو سکے۔

سوے اتفاق سے ہمارے یہاں ایسے وسائل کی نسبتاً کمی ہے جن کے توسط سے تحقیق یا ترتیب کا کام کرنے والے کے لیے اپنے مطلوبہ مواد اور متعلقہ مصادر تک رسائی آسان ہو جائے۔

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس رسائی کا سب سے بڑا وسیلہ مختلف علمی کتاب خانے یا ان کی فہرستیں ہیں جبکہ صورت حال یہ ہے کہ اول تو کچھ خاص مقامات پر ہی اچھے کتاب خانے موجود ہیں پھر ان میں بھی بہت سے کتاب خانے ایسے ہیں جن کی فہرستیں یا تو مرتب ہی نہیں ہوئیں یا ہنوز ان کی اشاعت عمل میں نہیں آسکی اور ایسے کتاب خانے تو اور بھی کم ہیں جن کے توضیحی کیٹلاگ چھپ کر سامنے آئے ہیں۔ ایسی تفصیلی یا اجمالی فہرستوں کا بڑی بڑی لائبریریوں کے علاوہ یک جا صورت میں دستیاب ہونا بھی آسان نہیں۔

مشرقی ادبیات اور زبانوں سے متعلق بیش بہا علمی ذخیرے، نادر مخطوطے اور اہم قلمی نسخے انگلستان، فرانس، جرمنی اور یورپ کے بعض دوسرے ممالک کے عجائب گھروں اور قومی لائبریریوں کی زینت ہیں۔ ان میں سے کچھ ذخیروں کے بارے میں معلومات کے باوصف ان تک رسائی یا ان سے استفادہ (بسا اوقات) ایک بہت دشوار مرحلہ ہے۔

Scanned with CamScanner

ایسے علمی کتب خانوں میں جن کی فہرستیں مرتب ہو کر ہنوز سامنے نہیں آئیں پنجاب سنٹرل پبلک لائبریری پٹیالہ بطور خاص قابل ذکر ہے جس میں صدہا عربی فارسی اور اردو مخطوطات موجود ہیں۔ ان میں سے بہت سے اہم دکنی مخطوطوں کے علاوہ، شاہ مبارک آبروؔ، محمد شاکر ناجیؔ، میر الٰہی میرؔ، مرزا رفیع سوداؔ، میر نظام الدین ممنونؔ، شاہ محمد نصیر الدین دہلوی وغیرہ اساتذہ کے قلمی دیوان موجود ہیں۔ اسٹیٹ آرکائیوز پٹیالہ اور ہارڈنگ لائبریری دہلی کی بھی یہی صورت ہے۔ مولانا آزاد میونسپل لائبریری بھوپال بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔ ایسی مثالیں اور بھی مل جائیں گی۔

ذاتی ذخیروں اور ان میں موجود نایاب نسخوں اور نادر مخطوطوں تک رسائی اور بھی زیادہ مشکل ہے اور بیشتر حالتوں میں اسے ناممکن ہی سمجھنا چاہیے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے کلام انیسؔ کے قلمی مصادر تک اپنی رسائی اور اس کی دشواریوں کا ذکر اس طور پر کیا ہے۔

> "مرثیوں کے مختلف نسخے مختلف وقتوں میں مختلف لوگوں سے مستعار لے کر یا ان کے گھروں میں جا جا کر اپنے نسخوں سے ان کا مقابلہ کیا۔ اگر یہ سب نسخے کسی ایک کتب خانے میں یا مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہوتے یا کسی طرح ہر شخص کی دسترس کے اندر ہوتے تو میں ان کے اختلافات درج کرتے وقت ان کا حوالہ بھی دیتا جاتا۔ مگر خود مجھ کو ان کے حاصل کرنے میں اتنی دقت اور اتنی زحمت اٹھانا پڑی کہ میرا دل ہی جانتا ہے اور اب اگر دوبارہ ان سب کو فراہم کرنا چاہوں تو ایک مدت کی دوڑ دھوپ کے بعد بھی یقیناً کامیابی نہ ہوگی۔"[۱]

بہرحال تحقیق کے سلسلے میں کسی اجمالی فہرست کی دستیابی کو بھی اگرچہ غنیمت سمجھا جائے گا کہ اس سے بھی کم و بیش بعض ضروری باتوں کا علم ہو جاتا ہے لیکن وضاحتی فہرست کی عدم موجودگی میں یہ جاننا دشوار ہوتا ہے کہ کسی مخطوطے یا مطبوعہ نسخے کی اہمیت اس موضوع تحقیق سے متعلق کیا ہے یا پھر کیا ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر قصۂ چہار درویش کو سامنے رکھا جا سکتا ہے جس کے قلمی نسخے ایک سے زیادہ کتاب خانوں میں دستیاب ہیں لیکن اس کا

---

[۱] روح انیس ۳۰

قدیم ترین نسخہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی آزاد لائبریری میں ہے جو محمد معزالدین جہاں دار شاہ کے سنہ جلوس ۱۷۱۲ مطابق ۱۱۲۴ھ کا مکتوبہ ہے۔ اس نسخے کی قدامت کے پیش نظر قصہ چہار درویش پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے اس کی اہمیت دوسرے قلمی نسخوں سے کہیں زیادہ ہے اور اس اعتبار سے اس کا مطالعہ ناگزیر اہمیت رکھتا ہے۔

اس طرح اگر کسی نسخے کے بارے میں صحیح معلومات بہم پہنچ جائیں تو اس کی طرف رجوع اور اس سے استفادہ میں سہولت ہو سکتی ہے۔ موضوع سے متعلق اہم نسخوں کے مقابلے میں غیر اہم نسخوں پر ایک سرسری نظر ڈال لینا بھی بعض حالتوں میں کافی ہو سکتا ہے لیکن اسے کلیہ نہیں بنایا جا سکتا۔

دوسروں کی فراہم کردہ اطلاعات اور معلومات کی روشنی میں بھی بہت کچھ سوچا اور سمجھا جا سکتا ہے لیکن ان پر کلیتہً انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ کسی تحریر یا متن کا ذاتی مطالعہ کبھی کبھی نہایت اہم اور غیر متوقع نتائج تک پہنچا دیتا ہے۔

بڑے بڑے کتاب خانوں کے علاوہ جن کے بارے میں معلومات کے وسائل فی الجملہ بہم پہنچ جاتے ہیں چھوٹے چھوٹے کتاب خانوں اور ذاتی ذخیروں کے نوادر اکثر تاریکی میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی جب اچانک سامنے آتے ہیں تو اس پر حیرت ہوتی ہے کہ ایسی چنگاری بھی کہیں اپنی خاکستر میں چھپی تھی۔

اس کی ایک مثال نو دریافت بیاض غالب سے بھی دی جا سکتی ہے جسے غالب کی اپنی تحریر کہا گیا ہے۔ یہ نادر نسخہ بھوپال کے کسی ذاتی ذخیرے کی زینت رہا ہے۔ اس سے پیشتر غالب کا ایک اور بیش بہا نسخہ (نسخۂ حمیدیہ) بھی بھوپال ہی میں دریافت ہوا تھا۔ میر حسن کے والد میر ضاحک کا گم شدہ دیوان بھی بہار کے ایک غیر معروف نجی ذخیرے میں ملا ہے۔ قصہ مہر افروز و دل بر کی بھی یہی کہانی ہے جو آغا حیدر حسن کے ذاتی ذخیرۂ کتب کی زینت تھا۔ ڈاکٹر گیان چند جین کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق دیوان ہوس کا ایک بیش بہا مخطوطہ مولانا محوی صدیقی (بھوپال) کے ذاتی ذخیرے میں ہے۔ ایسی مثالیں اور بھی موجود ہیں اور نہ جانے کتنی مثالیں آئندہ نئے ذخیروں کی دریافت اور چھان بین کے بعد سامنے آئیں گی

بعض نسبتاً غیر معروف لائبریریوں میں بھی نہایت اہم نسخے مل جاتے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی لائبریری میں غالب کے اردو دیوان کا پہلا ایڈیشن موجود ہے جو ماہ شعبان ۱۲۵۷ھ

مطابق ماہ اکتوبر ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس دیوان کے نسخے بہت کم یاب ہیں۔ اسی طرح ہارڈنگ لائبریری میں بعض دوسرے نوادرات کے علاوہ دیوان غالب کا نسخۂ نظامی اشاعت ۱۲۷۸ھ۔ اور خواجہ میر درد کے دیوان کی اشاعت اول کا ایک نسخہ موجود ہے جو مطبع العلوم دہلی کالج سے سنہ ۱۸۴۱/۱۲۵۶ھ میں اشاعت پذیر ہوا تھا اور جس کی تصحیح و ترتیب کا کام مولوی امام بخش صہبائی نے انجام دیا تھا۔ اسی لائبریری میں منشی رگھوناتھ سنگھ ہاجر دہلوی کے خاندانی ذخیرۂ کتب سے تعلق رکھنے والی ایک ایسی قلمی بیاض بھی ہے جس میں شیخ ابراہیم ذوق کی کچھ ایسی شعری تخلیقات ملتی ہیں جو ذوق کے کسی اور قلمی یا مطبوعہ ماخذ میں دستیاب نہیں۔

کسی موضوع سے متعلق مصادر تک رسائی کے لیے کتاب خانوں کی فہرست ہائے کتب کے مطالعے کے علاوہ اشاعتی اداروں کی فہرستوں پر بھی ایک نظر ڈالنا مفید مطلب ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس موضوع پر یہ یہ کتابیں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔ نول کشور اور بعض دوسرے مطابع کی مطبوعہ کتابوں کے ساتھ کچھ ایسی کتابوں کی ایک فہرست بھی دی جاتی رہی ہے جن کو مطبع شائع کر چکا ہے۔ اس سے ان کتابوں کا نام اور زمانۂ اشاعت کا پتہ چل جاتا ہے اور ان کے تجسس کی راہ قدرے آسان ہو جاتی ہے۔

بعض علمی مقالوں اور تحقیقی کتابوں کے ماخذ اور حواشی پر نظر ڈالنے سے بھی کبھی مطبوعہ ماخذ کی دریافت میں سہولت ہو سکتی ہے۔ مختلف موضوعات پر تحقیق اور ترتیب کے سلسلے کا ضروری اور کبھی کبھی بہت اہم مواد تحقیقی صحیفوں اور علمی جریدوں میں بکھرا ہوا مل جاتا ہے۔ بعض رسائل ایسے مضامین و مقالات کا اشاریہ یا مقالہ نما بھی شائع کرتے ہیں۔ ایسے جرائد سے صرف نظر کسی طرح مناسب نہیں۔

بعض اہلِ علم حضرات سے مشورہ یا خط و کتابت بھی کبھی کبھی گراں قدر معلومات یا اہم دریافتوں تک رسائی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

مختلف وسائل کے ذریعے فراہم کردہ معلومات اور ذاتی تجسس و تفحص کے نتیجے میں جن ماخذ تک رسائی ممکن ہو ان کی مدد سے مصادر کی فہرست تیار کی جانی چاہیے۔ جو تحقیق اور ترتیب کے سلسلے کا ایک نہایت اہم مرحلہ ہے اور جس سے گزرے بغیر دوسرے مراحل کی طرف گام فرسائی "سفر بے برگ و ساماں" کا حکم رکھتی ہے۔

Scanned with CamScanner

معلومات کے تمام وسائل اور تفہیم کے تمام ممکن ذرائع تک رسائی اور ان کے مطالعے کے بعد تحقیق و ترتیب کا کام انجام دینے والے کے لیے یہ فیصلہ نسبتاً آسان ہو جاتا ہے کہ تمام وسائل، تفحص احوال اور تحقیقی مسائل میں یکساں طور پر اہم نہیں ہیں۔ ان کی افادیت و اہمیت علیٰ قدر مراتب ہے اس اعتبار سے مختلف مصادر کو چار درجات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) اساسی ماخذ (۲) ذیلی ماخذ

(۳) ضمنی ماخذ (۴) اضافی ماخذ

اساسی ماخذ کا اطلاق ان مصادر پر ہو سکتا ہے جن کا موضوع سے بنیادی اور براہِ راست تعلق ہو۔ ان کے ذیل میں ایسے کتب و رسائل کو رکھا جا سکتا ہے جن پر کسی متن تحقیق یا ترتیب کی اساس قائم کی جا سکے اور جن سے رجوع اور استفادہ کے بغیر اس متن کی تحقیق و ترتیب ممکن نہ ہو۔ ان مصادر کو (جیسا کہ اس سے پیشتر بھی اشارہ کیا جا چکا ہے) ہم ان کی خارجی نوعیت کے تحت قلمی اور مطبوعہ مصادر کی شقوں میں بانٹ سکتے ہیں لیکن داخلی یا افادی اعتبار سے ان کی درجہ بندی حسب ذیل طریقے پر کی جا سکتی ہے۔

الف/ق کے ذیل میں ان قلمی نسخوں کو رکھا جانا چاہیے جو مصنف کے خطی نسخے ہوں، مصنف کی اصلی روایت یا اس کے صحیح متن تک پہنچنے کا سب سے زیادہ قابل وثوق ذریعہ اس کی اپنی تحریر ہی ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس کی قرأت و سند ممکن ہو۔ اس کی ایک مثال "گل رعنا" بخط غالب سے اور دوسری مثال دیوان زادہ حاتم سے دی جا سکتی ہے۔

مجمع الانتخاب نسخہ سالار جنگ میوزیم حیدر آباد کو بھی اسی زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے جس سے متعلق اپنے مقالے میں زاہدہ نور الحسن نے لکھا ہے کہ یہ نسخہ نواب نور الامراء کو پیش کرنے کے لیے خود شاہ کمال نے مرتب کیا تھا۔ [۱]

اس کی ایک اور مثال عیار الشعر امولفہ خوب چند ذکا نسخہ کتاب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی سے پیش کی جا سکتی ہے جس کے حواشی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ خود مولف کا اپنا ہے۔

ایک اور مثال گلشن بے خار کے اس قلمی مسودے سے دی جا سکتی ہے جو فرخ جلالی صاحب (آزاد لائبریری علی گڑھ) کے بیان کے مطابق نواب اسمٰعیل خاں مرحوم نے

---

[۱] ماخوذ از مقالہ

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے ذاتی ذخیرۂ کتب کے ساتھ آزاد لائبریری کو عنایت کیا تھا۔

اس ضمن میں کچھ مثالیں ایسی بھی مل سکتی ہیں جہاں مولّف کے ہاتھ کا کوئی باقاعدہ مرتب و منضبط نسخہ تو نہیں ملتا لیکن کچھ شعری تخلیقات کچھ تحریروں یا خطوط وغیرہ کے مسودے یا مبیضے ضرور مل جاتے ہیں۔ ایسی تحریریں کسی مکمل متن کی کمی کی تلافی نہیں کر سکتیں لیکن تحقیقی نقطۂ نظر سے اس کا امکان ہے کہ کسی متن کی ترتیب کے سلسلے میں ان اوریجنل (Original) تحریروں سے بعض مسائل کے سمجھنے اور بعض گتھیوں کو سلجھانے میں غیر معمولی مدد مل جائے۔ یہاں مثال کے طور پر ہم ذوقؔ کے ان مسودات کا ذکر کر سکتے ہیں جن سے بعض غزلوں اور قصیدوں کی اصل روایات سامنے آتی ہیں۔

ب/ق کے تحت ایسے قلمی نسخوں کو رکھا جانا چاہیے جو مصنّف کی زیرِ نگرانی تیار کیے گئے ہوں یا اس کی نظر سے گزر چکے ہوں اور اس کی مہر یا اصلاحات و اضافات سے مزیّن ہوں اس نوعیت کے نسخوں کی ایک مثال کے طور پر دیوانِ غالبؔ نسخۂ حمیدیہ کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ نسخہ غالبؔ کے ابتدائی دورِ شاعری کے مجموعہ ہائے کلام میں سے ہے۔ اس کی تسوید ۱۸۲۱ء مطابق ۱۲۳۷ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ اس میں حواشی پر غالبؔ کے اپنے قلم سے بہت سے اضافے ملتے ہیں۔ یہ نسخہ نواب فوجدار محمد خاں کی مہر ۱۲۴۸ھ سے مزیّن ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ نواب صاحب کے کتاب خانے میں اپنی تاریخ تحریر سے گیارہ یا تقریباً بارہ سال بعد پہنچا۔ اس پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر حمید احمد خاں نے لکھا ہے:

"گمان غالب ہے کہ قلمی دیوان میں حاشیے کے اضافے اور متن کی ترمیمات ۱۲۳۷ اور ۱۲۴۸ھ کے درمیان درج ہو چکی تھیں۔"[۵]

اس کی دوسری مثال گلشنِ بے خار نسخہ لاہور سے دی جا سکتی ہے۔ یہ نسخہ شعبۂ مخطوطات پنجاب سنٹرل پبلک لائبریری لاہور کی زینت ہے۔ اس پر تاریخ کتابت دوم شہر شوال ۱۲۵۲ھ درج ہے اور فہرستِ مخطوطاتِ کتاب خانۂ مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ مصنّف کے زیرِ نظر رہا ہے اور اس کے اضافات و اصلاحات سے مزیّن ہے۔

۵۔ نسخۂ مجلس: ۲

آبِ حیات (قلمی) نسخۂ آغا باقر (لاہور) کو بھی اس زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ یہ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کا اپنا قلمی یا خطی نسخہ تو نہیں ہے لیکن اس میں جگہ جگہ مولانا۔ کے قلم سے اصلاحات و ترمیمات موجود ہیں۔ مختلف مخطوطات کے سلسلے میں اور بھی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔

ج/ق کے تحت ایسے قلمی نسخے آئیں گے جن کو مصنف کے کسی دوست، عزیز یا قریب تر فرد نے مرتب کیا ہو۔ اس نوعیت کے نسخوں کی ایک مثال اس قلمی بیاض سے دی جا سکتی ہے جس میں ذوق کی متعدد غزلیں مولانا محمد باقر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں بعض غزلیں مولانا محمد حسین آزاد کی نقل کردہ ہیں اور کچھ ذوق کے ایک شاگرد مولوی دلدار علی مذاق بدایونی نے اپنے قلم سے لکھی ہیں جن کے ساتھ "میاں ذوق سلمہٗ" لکھا گیا ہے۔ اس میں ایک سے زیادہ غزلیں ذوق کی اپنی تحریر کردہ ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ مجموعۂ سخن ان کی نظر سے گزر چکا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اس قلمی بیاض کے سلسلے میں لکھا ہے:

> "والد مرحوم کے ہاتھ کی بہت تحریریں ہیں۔ بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے میں کہ حاضر و غائب لکھتا اور جمع کرتا تھا۔
>
> والد مرحوم نے آغازِ شباب میں کئی بیاضیں بنائی تھیں۔ وہ ہمیشہ علمی اور منصبی کاروبار میں عدیم الفرصت تھے باوجود اس کے جب فرصت پاتے تو اُستاد کا کلام ان سے لیتے اور صاف کرتے جاتے۔"[1]

اس کی ایک اور مثال دیوانِ سودا کے اس نسخے سے دی جا سکتی ہے جو ان کے شاگرد اصلح الدین نے ان کی زندگی میں مرتب کیا تھا۔ جس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ اپنے ترقیمے میں اس نے سودا کو "سلمہ اللہ تعالیٰ" لکھا ہے۔[2]

د/ق۔ اس کے ذیل میں ایسے قلمی نسخے آنے چاہئیں جو خاص اہتمام سے تیار کیے گئے ہوں یا خصوصیت سے انھیں کسی مقتدر شخصیت کو پیش کیا گیا ہو۔ اس لیے کہ ایسے نسخوں کے سلسلے میں صحتِ متن اور درستی تسوید کا زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال دیوانِ غالب

---

[1] دیوان ذوق (آزاد)

[2] ملاحظہ ہو سودا از شیخ چاند، ۱۰۵

کے اس نسخے سے بھی دی جا سکتی ہے جسے خود غالب نے نواب رامپور کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس کی ایک دوسری مثال دیوان سودا کے نسخۂ جانسن سے دی جا سکتی ہے۔

ہ/ق کے ذیل میں ایسے قلمی نسخے رکھے جانے چاہئیں جو مذکورہ خصوصیات کے حامل چاہے نہ ہوں لیکن قلمی نسخے ہونے کی حیثیت سے ان کی اہمیت و افادیت مسلّم ہو۔ ان میں قدیم تر اور خوش خط نسخے کو مقابلتاً زیادہ اہم اور لائقِ ترجیح سمجھنا چاہیے۔ قدیم تر نسخے کے بعد ترتیب نسخ میں اس نسخے کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگی جو نسبتاً زیادہ جامع اور مکمل ہوگا۔ بشرطیکہ اس کی استنادی حیثیت مشتبہ نہ ہو۔

ان مختلف نسخوں کی مثالوں میں سے ایک مثال کے طور پر دیوانِ غالب کے نسخۂ شیرانی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ نسخہ بہت خوش خط اور خوبصورت ہے۔ اگرچہ اس پر ایسا کوئی ترقیمہ درج نہیں ہے جس سے اس کے زمانۂ تحریر کا حتمی تعین ہو سکے لیکن داخلی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ بیاض غالب اور نسخۂ حمیدیہ کو چھوڑتے ہوئے دیوانِ غالب کا سب سے قدیم نسخہ ہے۔ اس کی ایک اور مثال دیوان شاہ مبارک آبرو نسخۂ پٹیالہ سے دی جا سکتی ہے جو اس کے تعلیقہ کی روایت کے مطابق ۱۱۵۴ھ کا مرتب کردہ ہے اور اس وقت تک کے دریافت شدہ نسخوں میں سب سے قدیم ہے۔

کلیات میر کا ایک ایسا ہی قدیم تر نسخہ ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ اسے دو کاتبوں نے لکھا ہے۔ پہلا حصہ محمد علی رضوی نے نقل کیا ہے جو ۶۲ صفحات تک چلا گیا ہے بعد ازاں رادھا کشن کا نقل کردہ ہے دونوں کے ترقیموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ شہر ذی قعدہ ۱۱۹۳ھ میں بعہد شاہ عالم مطابق سنہ ۲۰ جلوس کا نقل کردہ ہے۔

دوسری نوعیت کے نسخوں میں کلیات شاہ نصیر کے اس نسخے کو سامنے لایا جا سکتا ہے جو محمد حسین خاں تحسین کے بیٹے عبدالرحمٰن آہی کا مرتب کردہ ہے اور کلیات شاہ نصیر کے معلوم نسخوں میں سب سے مکمل اور مبسوط ہے۔ یہ نسخہ رضا لائبریری رام پور کی زینت ہے۔

بیشتر حالتوں میں قدیم نسخہ بعد کے نسخوں کے مقابلہ میں (نسبتاً) زیادہ صحیح اغلاط سے بہت حد تک مبرّا، زوائد سے پاک اور صحت روایت سے قریب ہوتا ہے اور ایسے ہی کسی نسخے کو متن کی اساس بنایا جانا چاہیے۔

اگر کسی متن کے متعدد نسخے موجود ہوں تو اُن سے حسب ضرورت استفادہ کیا جا سکتا ہے

لیکن صرف اہم اور قدیم نسخے ہی متن کی اساس بنائے جا سکتے ہیں۔

قلمی نسخوں کی کثرت عام طور پر ایسی تصانیف میں ملتی ہے جو اپنے عہد میں یا اس کے بعد ایک اچھے خاصے لمبے عرصے تک مقبول رہی ہوں یا پھر ان کو داخل درسیات رکھا گیا ہو۔ فارسی ادبیات میں اس کی بکثرت اور متنوع مثالیں موجود ہیں۔ اُردو میں بھی کثرتِ نسخ کی متعدد مثالیں مل جائیں گی۔ اس ضمن میں دیوانِ ولی کے قلمی نسخوں کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے لکھا ہے:

"دیوان ولی کے قلمی نسخے ملک میں بہت ملتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بارہویں صدی ہجری میں اس کا دیوان سب سے زیادہ معروف اور مقبول تھا۔"[۱]

میر کے نسخوں کو بھی اسی ذیل میں رکھ سکتے ہیں جن کی مقبولیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے:

"آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے بھی ان کا کلام اسی طرح مقبول اور معروف تھا۔ اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ طباعت و اشاعت کے وسائل نہ ہونے کے باوجود ان کی تصانیف کے درجنوں نسخے مختلف کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔"[۲]

اس کے برعکس اگر قلمی نسخوں کی کمی یا فقدان ہے تو جو نسخہ بھی دریافت یا دستیاب ہوگا وہی اساسی اہمیت کا حامل سمجھا جائے گا اور قلمی نسخوں کی عدم موجودگی میں مطبوعہ نسخے یا نسخوں پر ہی اکتفا کیا جائے گا لیکن اس صورت میں بھی قلمی نسخوں ہی کی طرح ان کی قدامت اور استنادی حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی درجہ بندی کی جائے گی۔ (یہ درجہ بندی اس وقت بھی ہو سکتی ہے جبکہ مطبوعہ نسخوں کے ساتھ قلمی نسخے بھی موجود ہیں۔)

الف/م کے ذیل میں ایسے مطبوعہ نسخے آئیں گے جن کی تصحیح یا اشاعت مصنف کے زیر نگرانی عمل میں آئی ہو۔ اس کی ایک مثال کے طور پر ہم دیوانِ غالب کے فرسٹ ایڈیشن اور نسخۂ نظامی کو پیش کر سکتے ہیں۔ مرزا غالب کے دیوان کا پہلا ایڈیشن ماہ شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق

---

[۱] کلیاتِ ولی، ۵۰ [۲] میر نمبر، ۳۹۷

ماہ اکتوبر ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس ایڈیشن کے نسخے بہت کم یاب ہیں۔ اس کے شروع میں غالب کا اپنا فارسی دیباچہ اور آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تقریظ شامل ہے جس کا سنہ تحریر ۱۲۵۴ھ ہے۔

غدر کے بعد دیوانِ غالب کا ایک ایڈیشن محمد حسین خاں تحسین کے مطبع سے اشاعت پذیر ہوا تھا لیکن یہ نسخہ اتنا غلط چھپا تھا کہ مرزا نے خود ایک نسخے پر نظرِ ثانی کی اور اپنی تصحیح کے ساتھ مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں کو دے دیا جنھوں نے اسے مطبع نظامی کانپور کے مہتمم کے پاس اشاعت کی غرض سے بھیج دیا۔ یہ نسخہ ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ دیوانِ غالب طبع اوّل اور نسخۂ نظامی اپنے مشتملات کے اعتبار سے ایک نہیں ہیں؟ اس کی ایک اور مثال کے طور پر ہم آثار الصنادید کا ذکر کر سکتے ہیں جس کا فرسٹ ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا۔ ۱۸۵۴ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن مرتب کیا گیا۔ اس میں سرسید کے دست و قلم سے بہت سی اہم تبدیلیاں عمل میں آئیں اور اس کی ترتیب کی بعض خامیاں دور کرنے کی کوشش کی گئی۔" طبعِ اوّل میں اگرچہ عمارتوں کے تمام نقشے موجود تھے لیکن ان عمارات سے متعلق کتبے نہ تو اپنی جگہ مکمل تھے اور نہ ہی انھیں صحیح ڈھنگ سے نقل کیا گیا تھا۔ نیز پہلے ایڈیشن کی زبان بھی پرتکلف، اور مبالغہ آمیز تھی جو ایک تحقیقی اور علمی کتاب کے لیے موزوں نہ تھی۔ عبارت کی اسی خامی کو سرسید نے اپنے دوسرے ایڈیشن میں رفع کیا۔[1] یہ دوسری بات ہے کہ طبع اوّل کے مشتملات اور اس کے اسلوب نگارش کی تاریخی و ادبی نوعیت کے پیشِ نظر اس کی اہمیت سے صرف نظر کی گنجائش نہیں

اسی زمرہ میں کاظم علی جوان کے ترجمہ شکنتلا کی اشاعتِ اوّل کو شامل کیا جا سکتا ہے جس کے ساتھ ایک دیباچہ بھی ہے جو ان کے تذکرۂ احوال اور ترجمہ کتاب کے سلسلے میں بعض نہایت اہم معلومات پر مشتمل ہے۔

ان کی دوسری کتاب "بارہ ماسہ دستورِ ہند" مطبوعہ سنہ ۱۸۱۲ کو بھی ہم اسی نوع کے متون میں شامل کر سکتے ہیں۔ میر شیر علی افسوس کے ترجمہ گلستان "باغ اردو" کی اشاعت اوّل بھی اسی زمرہ میں آتی ہے۔

---

[1] آثار الصنادید (طبع جدید)

قدیم اشاعتیں مختلف اعتبارات سے اہم ہوتی ہیں۔ ان میں صحت متن اور صدق روایت کو اساسی اہمیت حاصل ہے اور جب یہ حقیقت سامنے آجائے کہ مصنف نے خود ایسی کسی اشاعت کی نگرانی یا ایک سے زیادہ اشاعتوں پر نظر ثانی کی ہے تو ان اشاعتوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ایسی اشاعتوں کی مثالیں جنھوں نے مصنف کی نظر ثانی سے نور پایا ہو اور بھی مل سکتی ہیں۔

ب/م۔ اس کے تحت ایسے نسخے رکھے جاسکتے ہیں جن کی تصحیح و ترتیب کا کام مصنف یا شاعر کی زندگی میں اس کے کسی متعلقہ شخص نے انجام دیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورتوں میں خود مصنف اصلاح اغلاط و تصحیح کے کام میں شریک نہیں ہوتا لیکن بالواسطہ طور پر وہ اس سے متعلق ضرور ہوتا ہے۔ اس کی مثال دیوانِ ظفر کی اس خاص اشاعت سے دی جاسکتی ہے جس کی تصحیح کا کام ظفر کے اُستادِ شاعری شیخ ابراہیم ذوق نے انجام دیا تھا۔ ظفر کا دیوان پہلے مطبع سلطانی سے چار جلدوں میں شائع ہوا تھا مگر اس میں کتابت کی بہت سی غلطیوں کی راہ پانے کی وجہ سے یہ دیوان بادشاہ کو پسند نہ آیا اور پھر استاد شاہی کی زیرِ نگرانی اس کی تصحیح عمل میں آئی۔ اس بار چاروں دیوان یک جا صورت میں مطبع دہلی اُردو اخبار سے ۱۲۶۲ھ میں اشاعت پذیر ہوئے جس کے ساتھ مذکورۂ بالا حقیقت کی وضاحت بھی کی گئی۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہاں نظرِ ثانی اگرچہ براہ راست مصنف کی جانب سے نہیں ہوئی لیکن ایک ایسے شخص نے یہ کام انجام دیا جو مصنف کا اُستاد تھا اور جس کی سعی و کاوش کو خود مصنف کی ہر طرح تائید حاصل تھی۔ اس کی قدرے مختلف نوعیت کی کچھ دوسری مثالوں میں غالب کے اُردو خطوط کے پہلے دو مجموعوں اُردوئے معلّٰی اور عودِ ہندی کو بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ دونوں مجموعوں کی اشاعت کی تیاری غالب کی زندگی ہی میں عمل میں آئی۔ خطوط کی فراہمی کی کوششوں میں غالب کی اپنی سعی و کاوش کو بھی کم و بیش دخل رہا۔ اُردوئے معلّٰی کا دیباچہ غالب کے عزیز شاگرد میر مجروح نے لکھا۔ عودِ ہندی کا دیباچہ چودھری عبدالغفور سرور کے رشحاتِ قلم سے ہے۔ یہ دیباچہ غالب کی نظر سے بھی گزرا تھا اور غالب نے جیسا کہ چودھری صاحب کے نام ان کے خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے ایک فقرے کی اصلاح بھی کی تھی۔

ج/م اس کے ذیل میں ہم ایسے نسخوں کو رکھ سکتے ہیں جو اشاعتہائے اوّل ہوں اور

مصنّف کی زندگی میں سامنے آئے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسے نسخے چاہے ان کے ساتھ یہ وضاحت نہ ہو کہ ان کی اشاعت مصنّف کی زیر نگرانی عمل میں آئی ہے۔ پھر بھی اس کا واضح امکان رہتا ہے کہ مصنّف نے اس ایڈیشن کی تیاری و اشاعت سے فی الجملہ دل چسپی کا اظہار کیا ہو۔ بیشتر قدیم ایڈیشن جو اپنے مصنّفین کے زمانۂ حیات میں اشاعت پذیر ہوئے۔ اس زمرے میں شامل ہیں۔ اس موقع پر دیوان حالی مع مقدمہ (شعر و شاعری) مطبوعہ نامی پریس کانپور ۱۸۹۳ء موازنۂ انیس و دبیر مطبوعہ مفید عام آگرہ ۱۹۰۷ء سے دی جا سکتی ہے۔

د/م کے تحت ایسے مطبوعہ نسخے رکھے جائیں گے جو مصنّف یا مولّف کی وفات کے بعد خاص اہتمام یا انتظام سے شائع کیے گئے ہوں بالخصوص ایسی حالت میں ان کی اہمیت اور بڑھ جائے گی جبکہ اس اشاعت کی ترتیب و تصحیح میں مصنّف کے کسی عزیز شاگرد یا ایک سے زیادہ اہم افراد کو نمایاں طور پر دخل رہا ہو جس کی وجہ سے اس اشاعت کو زیادہ قابل اطمینان اور صحت و روایت کے اعتبار سے زیادہ معتبر قرار دیا جا سکے۔ اس کی ایک عمدہ مثال دیوانِ ذوق کے اس نسخے سے دی جا سکتی ہے جسے ان کی وفات کے بعد ان کے شاگرد حافظ ویران نے ظہیر دہلوی اور ان کے چھوٹے بھائی انور دہلوی کے ساتھ مل کر ترتیب دیا تھا اور جس کی کتابت خود انور دہلوی نے کی تھی جو اپنے وقت کے ایک بہت اچھے خطاط تھے۔ اس دیوان کا دیباچہ بھی خود انور نے لکھا تھا جس میں بوضاحت ان امور کی طرف اشارہ موجود ہے:

> ... حافظ غلام رسول صاحب المتخلص ویران ارشد تلامذہ حضرت استاد ... کہ بست سال ہمہ وقت و ہمہ ساعت باستحصال ہر نوع فیض خدمت حضرت اوستادِ مغفور سرمایہ اندوز سعادت گشتہ تمامی کلام آن یگانہ کشور سخن از زبان الہام ترجمان شنیدہ اکثر از ان یاد کردند و اکثر را زیر خیال داشتند ... علاوہ از کلام فراہم آمدہ بسا بسا غزلیات نایاب و قصائد و قطعات و رباعیات ہر قدر از اصناف شعرا زیاد خود از معدن سینہ جواہر گنجینہ بر زبان آوردہ بسفینہ ثبت کنانیدند و اکثر مسودات قصائد و غزلیات رقم فرمودہ آن مغفور کہ چون حرز جاں پیش خود می داشتند و خود ہم نظر بہ ترتیب و تصحیح گماشتند ....
> .... از قصائد و غزلیات و قطعات و مسدّسات تمام و غیر تمام و

رباعیات و قطعات و دیگر متفرقات، ہر قدر سامان کہ بدست آمد فراہم گردید۔ جناب برادر صاحب حقیقی این بندہ المسمی بہ سید ظہیر الدین صاحب المتخلص بہ ظہیر... و این نقش باطل افتادہ بر کنار صفحۂ روزگار امراؤ مرزا انور۔ درین زمان کہ سنہ ۱۲۷۹ھ یکہزار و دوصد و ہفتاد و نہ ہجری نبوی است باشتراک جناب حافظ صاحب موصوف بجمال تصحیح و تنقیح و پاک کردن از الحاق کلام دیگران در رشتۂ تالیف و ترتیب کشیدم و من بعد بہ نگارش کانپی این گلدستہ جناں این نامہ سیاہ .... بہرہ اندوز سعادت گردید۔"[1]

اس کی دوسری مثال ہمیں دیوان "دفترِ فصاحت" کی اشاعت اوّل کی صورت میں ملتی ہے۔ یہ نسخہ جو مطبع مصطفائی محمد مصطفےٰ خاں میں طبع ہوا تھا اور جس کی اشاعت کا سال ۱۲۷۲ ہے اس کے متن کی تیاری میں خواجہ وزیر کے دو شاگردوں سید ہادی علی اور سید محسن علی نے بطور خاص حصّہ لیا تھا اور جو شیخ اشرف علی کے اہتمام سے انتسویں تاریخ ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ کو اشاعت پذیر ہوا تھا۔ اس کی داستان بھی کچھ دیوان ذوق ہی جیسی ہے۔ چنانچہ خاتمۃ الطبع کے عنوان سے لکھا گیا ہے:

مستغنی المزاجی اور آزاد طبعی سے کہ لازمہ اہل کمال ہے سوائے احباب و تلامیذ کے ایک پرچہ بھی مصنّف کے پاس کبھی نہ دیکھا۔ الحمد للہ ان ایّام جمعیت انتظام میں ہزاراں جانفشانی اور سعی محبّان ولی سید ہادی علی اور سید محسن علی صاحب نے کہ خیلی شاگردان عالی وقار اور سر دفتر تلمیذانِ با اعتبار جناب غفران مآب یہ گلدستہ لخت جگر کہ ورق ورق اور پرچہ پرچہ اس کا مثل اوراق گل پریشاں اور منتشر تھا بکمال محنت فراہم ہوا اور مرتب ہو کر موسوم بہ دفتر فصاحت ہوا۔"[2]

قدرے مختلف نوعیت کی ایک اور مثال دیوان ذوق ہی کی ایک اور اشاعت یا

---

[1] دیوانِ ذوق (نسخۂ ویران): ۱۸، ۱۹

[2] دفتر فصاحت ۲۳۸

ترتیب سے دی جاسکتی ہے جو مولانا محمد حسین آزاد کے ہاتھوں عمل میں آئی یہ ذوق کے ایک اور نہایت عزیز شاگرد تھے۔ آزاد کی روایت نسخہ ویران سے بہت کچھ مختلف ہے اور اس کی ترتیب کا زمانہ بھی کافی بعد کا ہے اس اثنار میں نسخہ ویران پر مبنی بہت سی اشاعتیں سامنے آچکی تھیں لیکن چونکہ یہ اشاعت ان سب سے الگ ہے اس وجہ سے دیوان ذوق کی ترتیب میں اسے اساسی ماخذ کے ذیل میں جگہ دی جائے گی۔

اسی قبیل کے نسخوں کی ایک اور مثال کلیاتِ ناسخ کے نسخۂ مطبوعہ مطبع محمدی اور اس نسخہ پر مبنی اشاعت دوم سے دی جاسکتی ہے جس کی تصحیح کا کام میر اوسط علی رشک نے انجام دیا۔ کلیاتِ ناسخ کی پہلی اشاعت ان کی وفات کے چار سال بعد ۱۲۵۸ میں بتاریخ بست ویکم ذالحجہ سنہ یکہزار و دوصد پنجاہ وہشت ہجری در مطبع محمدی بکتابت عبدالحق ولد مولوی عبدالستار طبع ہوکر سامنے آئی۔ اس اشاعت کے خاتمے پر آنے والے دیباچے سے پتہ چلتا ہے کہ ناسخ کے ہر سہ دیوان اس میں موجود ہیں:

> "دیوان اوّل مسمی بہ دیوان ناسخ در متن و دیوان دوم مسمی بہ دفتر پریشاں بر حاشیہ و دیوان سوم مسمی بہ دفتر شعر در ہر ردیف بہ ضمیمہ دفتر پریساں و مثنوی و رباعیات و تاریخہا نیز در متن و بعضے از تاریخہا و رباعیات بر حاشیہ۔"[۵]

اس طرح کے نسخوں کی قدرے مختلف مگر نہایت اہم مثال کلیاتِ میر کی اوّلین اشاعت سے دی جاسکتی ہے جس کے سرورق کی عبارت اس اہتمام کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

کلیات میر تقی مدرسہ عالیہ کے لیے نوازش و تفضلات سے صاحبان کالج کاؤنسل کے عہد حکومت میں زبدۂ نوئینان عظیم الشان مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر دام ظلہ کے حسب الارشاد کپتان ٹیلر صاحب مدرس ہندی دام اقبالہ اور اعانت و پرورش سے ڈاکٹر ولیم ہنٹر صاحب دام حشمتہ اور عنایت و کرم سے کپتان گالو صاحب دام ثروتہ اور مرحمت و امداد سے کپتان ٹامس روبک صاحب دام افضالہ کی بہ تصحیح مرزا کاظم علی جوان و مرزا جان عیش و مولوی محمد اسلم و تارنی چرن و منشی غلام اکبر سنہ ۱۸۱۱ء میں مطابق سنہ ۱۲۲۶

---

۵ ملاحظہ ہو دیوان ناسخ طبع اوّل: ۴۰۲

ہجری ہندوستانی / چھاپہ خانے میں چھاپا / کیا ہو منشی امداد بخش کا۔
اس سے پتہ چلتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کی اس اشاعت کے اہتمام میں کون کون افراد شریک تھے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اس کے تعارف کے ذیل میں لکھا ہے کہ کلیات کے آخری ورق کا کم و بیش ایک ثلث ضائع ہو گیا ہے۔ جو ٹکڑا باقی ہے اس میں مرقوم ہے۔

College of Fort William and edited by learned Moonshees attached to the college. Calcutta in the Hindustanee Press by A N Hubleard 1811—

یہ اشاعت طبع اوّل ہونے کے علاوہ اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ میر کی وفات کے بعد ایک سال کے اندر سامنے آ گئی۔ ایک اور مثال کلیاتِ سودا کے اس اوّلین مطبوعہ نسخہ کی شکل میں پیش کی جا سکتی ہے جو فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) ہی سے ۱۸۰۳ء میں اشاعت پذیر ہوا اور جس کی تصحیح کا کام میر شیر علی افسوس نے انجام دیا۔

۵/م۔ ان سے قدرے مختلف نوعیت کی مثال دیوان دردؔ کی اس اشاعتِ اوّل سے پیش کی جا سکتی ہے جس کی تصحیح کا کام مولوی امام بخش صہبائی نے انجام دیا تھا۔ اس کی وضاحت اشاعت مذکور کے سرورق کے ان اندراجات سے ہوتی ہے۔

Deewan Khawja Meer Dard of Delhi revised by Maulvi Emam Baksh of The Delhi College–1847

دیوان خواجہ میر دردؔ دہلوی قدس سرہ کا بہ تصحیح جناب مولوی امام بخش صاحب متخلص بہ صہبائی مدرس اوّل فارسی مدرسہ دہلی اور اہتمام پنڈت دھرم نارائن کے مطبع العلوم مدرسہ دہلی میں چھپا۔

۶/م۔ اس کے ذیل میں ایسے نسخوں کو رکھا جا سکتا ہے جو فرسٹ ایڈیشن ہوں مگر ایسی کسی خصوصیت کے حامل نہ ہوں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس لیے کہ ایسی صورت میں انھیں مقدمۃ الذکر اشاعتوں کے ذیل میں رکھا جائے گا۔ بصورتِ دیگر انھیں دوسری اشاعتوں سے مقدم رکھا جائے گا اور متن کی ترتیب میں ان کو اساسی اہمیت حاصل ہو جائے گی۔
یہاں بطور مثال غیاث اللغات کے اس نسخے کو سامنے رکھا جا سکتا ہے جو مطبع العلوم

---

۱ دلّی کالج میگزین (میر نمبر) : ۳۸۱

Scanned with CamScanner

سینٹ اسٹیفیں کالج دہلی سے ۱۸۶۱ء میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ مؤلف کتاب مولوی غیاث الدین ابن مولوی جلال الدین ساکن بلدۂ فاخرہ رامپور اس کی ترتیب سے اس کے دیباچہ کی روایت کے مطابق ۱۲۴۲ھ میں فارغ ہوئے تھے۔ اشاعت کے موقع پر مطبع کی جانب سے اس کی تصحیح کا کام مولوی امین الدین نے انجام دیا تھا۔ اس کی اور ایک مثال گنج خوبی مولفہ میر امن کے اس نسخے سے دی جا سکتی ہے جو کلکتہ سے اردو رسم الخط ۱۸۴۶ء میں شائع ہوا تھا جس کا ایک نسخہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی کے پاس ہے۔ موصوف نے گارساں دتاسی کے حوالے سے لکھا ہے کہ سب سے پہلے یہ کتاب ناگری رسم الخط میں کلکتہ سے ۱۸۰۵ء میں شائع ہوئی تھی[۱] اس لیے اردو میں دوسرے ایڈیشن ہی کو فرسٹ ایڈیشن مانا جائے گا۔ اس ایڈیشن سے متعلق ضروری وضاحت اس کے بعد والے ایڈیشن میں ملتی ہے۔

"کتاب سعادت انتساب گنج خوبی ترجمہ کیا ہوا میر امن دہلی والے کا.... اشرف الامرا نواب گورنر جنرل سر ہنری ہارڈنگ بہادر دام اقبالہ کے عہد حکومت میں اور کپتان ترنبل مارشل بہادر... سکریٹری فورٹ ولیم کالج کے وقت میں اہتمام سے بندہ عاصی غلام حیدر ساکن (بلدہ) ہگلی کے شہر کلکتہ کے درمیان مطبع اصغری میں باہتمام جناب سید عبداللہ صاحب کے ۱۲۶۱ھ ہجری مطابق ۱۸۴۶ء کے چھاپی گئی تھی...[۲]"

خاص اہتمام سے شائع ہونے والے نسخوں میں بطور مثال یہاں یادگار غالب کے اس نسخے کو پیش کیا جا سکتا ہے جو حالی کی وفات کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع ہوا تھا جو دوسرے مطبوعہ نسخوں کے مقابلے میں طباعت و کتابت کے اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

ز/م۔ میں ایسے مطبوعہ نسخے رکھے جا سکتے ہیں جو کسی صاحب علم شخص کے مطالعے میں رہے ہوں۔ ایسے نسخوں کے مطالعے سے کبھی کبھی نہایت اہم معلومات سامنے آجاتی ہیں۔ کبھی ان حواشی کی مدد سے متن کی تکمیل میں مدد مل جاتی ہے کبھی متن سے متعلق مسائل یا کسی مسئلہ کی

---

[۱] گنج خوبی : ۱۱۷

[۲] گنج خوبی : ۱۱۷

تفہیم میں یہ حواشی بہت معاون ہوتے ہیں۔ اس کی ایک بہت اچھی مثال "رسالہ تذکرات" کا وہ مطبوعہ نسخہ ہے جو لاہور یونی ورسٹی کے ذخیرۂ کتب کی زینت ہے۔ اس سے کہیں یہ تو ظاہر نہیں ہوتا کہ حاشیہ نگار کون شخص ہے لیکن مشفق خواجہ صاحب کے بیان کے مطابق یہ حواشی بہار الدین بشیر نبیرۂ شاہ نصیر دہلی کے مرہون قلم ہیں۔ ان حواشی کے ذریعے سے بہت سے ان تذکروں کا نام یا حال معلوم ہوتا ہے جو گارساں دتاسی کے متن میں شامل نہیں تھے، ان میں بعض ایسے تذکرے بھی ہیں جو ہنوز ہماری دسترس سے باہر ہیں ــــــــ اس کی ایک اور مثال گلستان سخن کے اس مطبوعہ نسخے کی صورت میں موجود ہے جو وزیر الحسن عابدی شعبۂ فارسی اورینٹل کالج لاہور کے ذاتی ذخیرۂ کتب کی زینت ہے۔ اگرچہ یہ کوئی قدیم مطبوعہ نہیں ہے اور مطبوعہ رضوی کے مقابلے میں جو اس تذکرے کا فرسٹ ایڈیشن ہے اس کی اہمیت ثانوی ہے لیکن اس کے حواشی نے جو کسی باخبر شخص کے مطالعے کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں اس کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے۔ ایک موقع پر صاحب حواشی نے مرزا قادر بخش صابر کے تذکرے میں اس کی وضاحت کی ہے کہ یہ تذکرہ مولوی امام بخش صہبائی کی تالیف ہے۔

ح ر م کے زمرے میں ایسے نسخے شامل ہوں گے جو اشاعت اوّل طبع دوم یا کسی خاص اشاعت کے علاوہ ہوں۔ ایسے نسخے عام طور پر زیادہ اہم نہیں ہوتے لیکن ان میں بعض ایسے نسخے اہم ہو سکتے ہیں جو کسی قدیم نسخے پر مبنی ہوں۔ مثال کے طور پر ہم دیوانِ ذوق کے نسخے مطبوعہ مطبع مخزن العلوم غازی آباد کو پیش کر سکتے ہیں۔ یہ نسخہ ۱۸ صفر المظفر ۱۲۸۳ھ نبوی مطابق ۳ جولائی ۱۸۲۶ء کو اشاعت پذیر ہوا یعنی نسخہ ویرآن کی اشاعت کے پانچ برس بعد اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس وقت تک دیوانِ ذوق کے [نسخہ ویرآن کے علاوہ] ایک سے زیادہ دوسرے نسخے بھی شائع ہو چکے تھے جس میں محبس پریس والا نسخہ بطور خاص قابلِ ذکر ہے۔ اب یہ نسخہ بہت کم یاب ہے۔ مخزن العلوم والا نسخہ کارپردازان مطبع کے بیان کے مطابق اسی نسخے پر مبنی ہے چنانچہ خاتمۃ الطبع کے ذیل میں لکھا گیا ہے:

"الحمدللہ والمنۃ کہ نسخہ ہذا المشتہر بہ دیوان ذوق ۔۔۔۔ مطبع مخزن العلوم غازی آباد ضلع میرٹھ میں بہ تصحیح و تنقیح ما لاکلام کارپردازان مطبع کے اہتمام سے منطبع ہو کر مذاق بخش اہل سخن ہوا اور نسخہ موصوفہ مطبوعہ محبس پریس سے نقل کیا گیا۔ اطلاعاً ضبط تحریر میں آیا۔" (ص ۱۲۷)

طارم۔ کے ذیل میں ایسے مطبوعہ نسخے آئیں گے جو انتخاب کی حیثیت رکھتے ہوں یا جس میں کسی مصنف کے متن کا کوئی حصہ اپنی مکمل صورت میں اشاعت پذیر ہوا ہو۔

ظاہر ہے کہ ایسے انتخابات میں قدیم تر انتخابات کی اہمیت زیادہ ہوگی اور ایسے انتخابات کو اساسی طور پر نہایت اہم قرار دیا جائے گا جو کسی کم یاب متن پر مبنی ہوں یا مکمل متن کی اشاعت سے پہلے جن کا انتخاب عمل میں آیا ہو یا پھر وہ انتخاب قدیم اور بہت کم یاب ہو۔ پہلی صورت کی ایک مثال کے طور پر ہم انتخاب کلیات شاہ نصیر کو پیش کر سکتے ہیں۔

اس کی ایک اور دلچسپ مثال نگارستان سخن سے دی جا سکتی ہے جو ذوق مومن اور غالب کے انتخاب کلام پر مشتمل ہے۔ اس میں ذوق کی بعض ایسی غزلیں بھی شامل ہیں جو نہ صرف یہ کہ طبع اول میں موجود نہیں بلکہ ذوق کے کسی دوسرے مجموعہ کلام یا قلمی ماخذ میں بھی نظر سے نہیں گزریں۔ اس انتخاب کی ترتیب و اشاعت کا زمانہ بھی تقریباً وہی ہے جو نسخہ ویران کا ہے نیز یہ کہ اس کے مرتب ظہیر دہلوی ہیں جو نسخہ ویران کے مرتبین میں بھی شامل ہیں۔ دوسری نوعیت کی ایک مثال مسدس حالی کی قدیم تر طباعت سے پیش کی جا سکتی ہے۔ جو شہر جمادی الثانی ۱۲۹۶ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے اشاعت پذیر ہوئی۔

اس کے ساتھ عرض حال کے عنوان سے حالی کا وہ دیباچہ بھی ہے جس میں انھوں نے سیر زندگی کے طور پر اپنے فکر و خیال کی نشو و نما اور نقطۂ نظر کی تبدیلی کی کہانی سنائی ہے۔

ایک قدیم اور نایاب مطبوعہ انتخاب کی مثال ذوق کے ایک اور انتخاب سے دی جا سکتی ہے۔ یہ انتخاب جو قصائد استاد ابراہیم ذوق کے نام سے مطبع احمدی واقع شاہدرہ دلہائی میں باہتمام امو جان طبع ہوا اور جس کا زمانۂ اشاعت ۲۱ ماہ رمضان المعظم ۱۲۷۸ھ ہے صرف ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ذوق کے تین قصیدوں کچھ غزلوں اور ان کے ساتھ شہزادہ جواں بخت کی شادی کی تجدائی پر کہے جانے والے سہرے کو شامل کیا گیا ہے۔ اس میں ذوق کا نایاب کلام تو نہیں ملتا لیکن ذوق کے ایک قدیم مطبوعہ ماخذ کی حیثیت سے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی اور مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔ حسب ضرورت و موقع یہ ترتیب بدل بھی سکتی ہے۔

تنقیدِ متن

تنقیدِ متن (Textual Criticism) جیسا کہ اس کے اصطلاحی نام سے ظاہر ہے، اپنی نوعیت اور مقصد کے اعتبار سے اس تنقید سے مختلف ہے جسے ادبی تنقید (Literary Criticism) کہا جاتا ہے۔ ادبی تنقید میں ادب اور مقصدِ ادب سے متعلق مختلف زاویہ ہائے نگاہ کے تحت کسی شعری یا ادبی تصنیف کی فکری اور فنی قدر و قیمت کے تعین کی کوشش کی جاتی ہے، اور اس کے خوب و ناخوب کے بارے میں فیصلہ دیا جاتا ہے لیکن تنقیدِ متن کی صورت میں کسی غیر تحقیقی نقطۂ نظر کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ذاتی یا جماعتی پسند و ناپسند سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ یہاں تو متن سے متعلق مختلف خارجی و داخلی حقائق سے گفتگو کی جاتی ہے اور کسی متن کی تحقیقی اہمیت اور ترتیبِ متن کے نقطۂ نظر سے اس کی افادیت پر کوئی فیصلہ دیا جاتا ہے۔

تنقیدِ متن کے کام کو ہم اساسی طور پر دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

معروضی مطالعہ (Objective Study)

موضوعی مطالعہ (Subjective Study)

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ معروضی یا موضوعی مطالعہ بھی اپنے مفہوم اور معنی کے اعتبار سے ادبی تنقید کی خارجیت یا داخلیت سے بہ وجوہ مختلف ہے۔

معروضی مطالعے میں آنے والے امور کو ہم دو عنوانات کے تحت رکھ سکتے ہیں:

(۱) متنی معارض

(۲) متنی مواقف

متنی معارض میں کسی نسخے کی ہیئت، اس کی تقطیع، مسطر، تعداد اوراق یا صفحات

خالی ورق یا صفحے (اگر ہوں)، کاغذ، قلم، روشنائی، رسم کتابت، تزئین، مہریں، دستخط جیسے امور موضوع گفتگو بنتے ہیں۔ نو دریافت متون کی صورت میں ان کی دریافت کی کہانی اور اس سے متعلق ضروری باتیں بھی (جن میں افسانوی انداز فکر، جذباتی لب ولہجہ اور تاثراتی طرز گفتار سے امکانی طور پر بچنے کی ضرورت ہے) اس ضمن میں آسکتی ہیں۔

کم یاب کتب ورسائل کے سلسلے میں ان کے مخازن کا ذکر، اور اگر وہ کسی باقاعدہ لائبریری کی زینت ہیں تو نشان فہرست یا کیٹلاگ نمبر، مطبوعہ نسخوں کی صورت میں مطبع، مقام اور سالِ اشاعت کا حوالہ بھی متنی معارض پر گفتگو کے ضمن میں آتا ہے۔

متنی مواقف میں نسخہ کے مشتملات [اور شعری متون کی صورت میں مختلف اصناف سخن کا ذکر] (اس موقع پر تعداد اشعار بھی اگر دے دی جائے تو بہتر ہے) غیر تصنیفی حواشی (اگر موجود ہوں)، اصلاعات، قلم زد سطور یا منسوخ اشعار (بشرطیکہ ایسی کوئی صورت موجود ہو) نیز زمانۂ تالیف، تاریخ کتابت، تکملہ، خاتمہ، تتمہ، ترقیمہ، تعلیقات، قطعات وغیرہ میں سے جو بھی اس متن میں شامل ہوں اس پر مناسب حدود کے ساتھ بحث وغیرہ امور آتے ہیں۔ موخرالذکر اصطلاحات میں فرق معانی ومراتب ضروری ہے جس پر ہنوز مناسب توجہ نہیں دی گئی ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک تکملہ وہ ضمیمہ یا اجزائے متن ہیں جو متن کی تکمیل کے بعد اضافے کے طور پر شامل کیے گئے ہوں۔ اس کے مقابلے میں خاتمہ وہ اختتامی عبارت ہے جو مصنف یا مرتب نے سپرد قلم کی ہو۔ (مطبوعہ کتب ورسائل میں خاتمے کے عنوان سے مصححین یا ناشرین کی عبارتیں بھی ملتی ہیں جو نسخے کی اشاعت سے متعلق بعض امور کے بارے میں ہوتی ہیں۔)

ترقیمہ نقل کرنے والے شخص کی عبارت کو کہنا چاہیے جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ یہ نسخہ کہاں اور کب نقل کیا گیا اور نقل برداری کا فرض کس نے انجام دیا اور اس کے محرکات کیا تھے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر ترقیمے میں یہ تمام باتیں موجود ہوں۔

تعلیقات کا اطلاق دوسری نوعیت کی عبارتوں پر ہونا چاہیے جو بعض مطبوعات یا مخطوطات کے آخر میں شامل رہتی ہیں۔

متنی مواقف سے متعلق بعض امور کا تذکرہ متنی معارض کے ذیل میں آجاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اب تک تنقید متن کے مختلف ضوابط کو مدون نہیں کیا جاسکا۔ علاوہ بریں یہ نسخے کی اپنی نوعیت اور اس پر گفتگو کی مناسب حدود کا سوال ہے جس کا انحصار بہت کچھ

مرتب کی صواب دید پر ہوتا ہے۔

معروضی مطالعے کے مقابلے میں موضوعی مطالعے کو ہم تین حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) متنی معارف (۲) متنی مصادر (۳) متنی محاسن

متنی معارف کے ذیل میں متنی شواہد اور عصری معلومات کو رکھا جا سکتا ہے۔ متنی شواہد سے واضح طور پر یہ مراد ہے کہ کیا اس زیرِ بحث متن میں کسی دوسرے متن سے متعلق کوئی شہادت یا شواہد موجود ہیں۔ عصری معلومات میں تاریخی حقائق، سوانحی حصّے، تمدنی ماحول اور اس عہد کے تنقیدی میلان کو جگہ دی جا سکتی ہے۔

متنی مصادر میں ان کتب و رسائل اور وسیلہ ہائے معلومات کا ذکر کیا جا سکتا ہے جن کے حق میں کسی متن میں داخلی یا خارجی شواہد ملتے ہیں۔ تخلیقی متون میں مصادر کی نوعیت دوسری ہے وہاں یہ جاننے کی کوشش تحقیقی حدود میں کی جاتی ہے کہ مصنّف کے اکتسابی حد تک سرچشمہ ہائے فکر و فن کیا ہیں۔

متنی محاسن میں اسلوبِ نگارش پر خالص علمی نقطۂ نظر سے گفتگو کی جاتی ہے جس کا تحسین یا تعریض سے کوئی تعلق نہیں۔ صرف متنی حقائق کے ذیل میں اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے۔ قدیم متون کے سلسلے میں لسانی نقطۂ نظر سے متن کے محاسن پر بحث زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں جہاں تک لفظیات کا تعلق ہے لغوی حقائق اور لسانی حقائق میں فرق کرنا ضروری ہے۔

متن کے معروضی مطالعے کے حصّۂ اوّل و دوم (متنی معارض و متنی مواقف) سے متعلق ہماری زبان کی تحقیقی ادبیات میں مختلف و متنوع مثالیں سامنے آتی ہیں جن میں سے بعض کو یہاں پیش کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

کلیات میر حسن کا تعارف نامہ یا مختصر معروضی مطالعہ مولوی حبیب الرحمان خاں شیروانی (مرحوم) نے تذکرۂ شعرائے اردو مولفہ میر حسن کے مقدمے میں ان الفاظ کے ساتھ پیش کیا ہے:

"... لکھنؤ سے کلیات میر حسن کا نسخہ ہاتھ آیا جو ۱۲۵۶ھ کا لکھا ہوا ہے مطلّا اور مذہّب ہے اور اس اہتمام سے لکھا گیا ہے جس اہتمام سے فارسی شعرا کے دواوین لکھے جاتے تھے۔ تعجب بالائے تعجب یہ کہ قدرت اللہ

خاں قاسم کا قول بھی اس پر صادق آتا ہے۔ انواع سخن سے لبریز ہے۔ چار سو صفحہ کا حجم ہے۔ تقریباً سات ہزار شعر ہیں۔ غزل کے اشعار تقریباً چار ہزار ہیں۔ چھوٹی بڑی گیارہ مثنویاں ہیں۔ سات قصیدے ہیں۔ مخمس، مسدس، مثلث، رباعی بھی ہیں۔ وہ ترکیب بند بھی واسوخت کے نام سے موجود ہیں جن کا ذکر تذکرے میں میر حسن نے کیا ہے۔ مرثیے نہیں ہیں، حالانکہ میر حسن نے مرثیوں کا لکھنا تذکرے میں لکھا ہے۔[1]"

اس کی ایک اور مثال مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے قلم سے کلیات میر کے ایک نادر نسخے کے تعارف میں ملتی ہے:

"رضا لائبریری، رام پور، میں میر تقی میر کے کلیات کا ایک بہت اچھا نسخہ محفوظ ہے۔ اس میں نکات الشعرا کے علاوہ ان کی نظم و نثر کا سارا کام، دیوان اُردو اتا ۶، دیوان فارسی، فیضِ میر اور ذکرِ میر شامل ہیں۔

اس کی کتابت نہایت اہتمام سے کی گئی ہے۔ چنانچہ ذکر میر کو چھوڑ کر اور سب کتابوں کے شروع میں طلائی لوح اور پوری کتاب میں رنگین جدول کھینچی گئی ہے۔ پوری کتاب کے اوراق کی تعداد ۸۲۳ ہے اور فل اسکیپ ناپ کا، ۱۷ سطری مسطر کام میں لایا گیا ہے۔

دیوان اوّل کے خاتمہ پر ورق ۲۴۷ ب میں کاتب نے لکھا ہے:

دیوان اوّل من تصنیف میر محمد تقی صاحب بتاریخ بست و نہم شہر رمضان سنہ یکہزار و دوصد و چہل و پنج ہجری بخط بدربط حقیر فقیر پر تقصیر بندہ شیخ لطف علی حیدری، قلندری حسب فرمائش مرزا صاحب کرم گستر مرزا قنبر علی صاحب دام اشفاقہ، اختتام پذیرفت ....

کلیات کے آخر (ورق ۸۲۳ ب) میں لکھا ہے:

الحمد للہ کہ بفضل ایزد مستعان و عنایات ائمہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کہ

---

[1] تذکرۂ شعرائے اُردو، مقدمہ، ص ۹

کلیات میر محمد تقی صاحب غفراللہ ذنوبہ، بتاریخ سلخ شہر رمضان المبارک سنہ یکہزار و دو صد و چہل و شش ہجری بروز دوشنبہ یک پاس روز باقی ماندہ از خط بدر بط احقر العباد شیخ لطف علی حیدری بپاس خاطر فرمایش مرزا قنبر علی صاحب زاد اشفاقہ صورت اختتام پذیرفت۔

ان دونوں تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ لطف علی حیدری (غالباً بمعنی شیعی) نے مرزا قنبر علی کے لیے ایک برس اور دو یا تین دن میں اسے لکھا اور ۲۹ رمضان سنہ ۱۲۴۶ھ اس کی تاریخ اختتام تھی...

کسی صاحب ذوق نے اس نسخہ کے ابتدائی تین دیوان، دیوان سوم کی ردیف م تک بغور پڑھے ہیں، چنانچہ جگہ جگہ بین السطور اور حاشیوں میں الفاظ اور محاورات کے معنی، مصرعوں اور شعروں کی تشریح اور متبادل الفاظ درج کیے ہیں جن میں سے اکثر اختلاف نسخ کی حیثیت رکھتے ہیں...[1]"

اس تعارف کا پہلا حصہ متنی معارض سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا حصہ متنی مواقف سے جن کو دو الگ الگ عنوانوں کے تحت رکھ کر زیادہ سہولت سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کی تفصیلات اور جزئی امور سے متعلق بحث کا انحصار نسخہ کی اپنی نوعیت پر ہوتا ہے۔

بیاض آزاد:

"کلام ذوق پر مشتمل یہ نادر بیاض آغا محمد باقر، نبیرۂ آزاد (لاہور) کی ملکیت ہے۔ اس کو ہلکے مٹیالے رنگ کے کاغذ پر تیار کیا گیا ہے۔ اس دور کی بیاض سازی کی عام روش کے برعکس اس کی شکل کچھ رجسٹر جیسی ہے۔ یہ کل ۹۸ اوراق پر مشتمل ہے، اس کی تقطیع ۹ × ۱۲ ہے۔ دونوں جانب کے پشتے خستہ ہو چکے ہیں لیکن بیاض کا کاغذ ہنوز اچھی حالت میں ہے اور اس کے آثار کہنگی نے شکستگی کی شکل

---

[1] کلیات میر کا ایک نادر نسخہ، دہلی کالج اردو میگزین، میر نمبر، ۱۹۶۲ء ص ۶۸ تا ۳۶۷

اختیار نہیں کی، اگرچہ سوادِ خط روشن نہیں ہے اور خط بھی شروع سے آخر تک ایک نہیں، نیز غزلوں کی تسطر و تحریر میں بھی کوئی خاص سلیقہ یا طریقہ نہیں برتا گیا۔ بعض غزلوں کے مسودے پہلی بار اس بیاض کے اوراق پر ہی تیار کیے گئے ہیں۔ یہ ذوق کی اپنی تحریریں معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں جگہ جگہ اصلاحیں بھی ذوق کے اپنے قلم سے ہیں۔ جہاں غزلیں نقل کی گئی ہیں وہاں بھی سوادِ خط کچھ زیادہ روشن نہیں ہے۔ کچھ غزلیں ایسی بھی ہیں جو ہلکے سرمئی یا زعفرانی رنگ کی روشنائی سے لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف وقفوں میں ذوق کا جو کلام ان کی زندگی میں یا اس کے بعد دستیاب ہوتا رہا وہ اس بیاض میں نقل کیا جاتا رہا۔ بعض جگہوں پر خالی صفحات بھی چھوڑے گئے ہیں، شاید اس امید پر کہ اور غزلیں بھی ہو جائیں یا مل جائیں۔ اس کی بعض غزلیں ذوق کے مشہور شاگرد مولوی دلدار علی مذاق کی نقل کردہ ہیں۔ ان کے ساتھ میاں ذوق سلمہٗ لکھا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ ان غزلوں کی نقل کے وقت ذوق حیات تھے۔ اس سے ان غزلوں کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔[1]"

نو دریافت متون کے سلسلے میں احوالِ دریافت کی بھی اہمیت ہے۔ اس کی کچھ دلچسپ مثالیں گلِ رعنا مرتبہ مالک رام، مطبوعہ علمی مجلس، دہلی، اور کربل کتھا ترتیب دادۂ مالک رام اور ڈاکٹر مختار الدین آرزو کے دیباچوں میں مل سکتی ہیں۔ اس کی بعض اور مثالیں بھی سامنے آئی ہیں۔ اس ضمن میں زیادہ اہم بات اس رشتے کا پتہ چلانا ہوتا ہے جو اس نسخے اور اس کے مالک یا مخزن کے مابین ہوتا ہے جس سے اسکے سفرِ حیات کا کچھ حال معلوم ہو جاتا ہے اور ان رشتوں کا علم اس کی تحقیقی اہمیت کو بڑھا دیتا ہے۔ مثلاً مالک رام صاحب نے اپنے دریافت کردہ نسخۂ گل رعنا کے سلسلے میں صاحب نسخہ سید علی بلگرامی کے خاندان کا بھی ذکر کیا ہے

---

[1] [مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو] کلیاتِ ذوق مرتبہ راقم الحروف، مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء

اور اس ضمن میں لکھا ہے :

" (سید علی نقی بلگرامی کے جد بزرگوار) نواب عماد الملک (سید حسین بلگرامی) کے دادا مولوی سید کرم حسین تھے۔ ان کا خاندان بلگرامی سادات کا ہے ۔۔۔ مولوی کرم حسین کو عربی اور فارسی میں عالمانہ دستگاہ حاصل تھی۔ جس زمانے میں غالب کلکتے گئے ہیں، یہ وہاں شاہ اودھ کی طرف سے گورنر جنرل کے دربار میں سفیر تھے ۔۔۔۔

سید کرم حسین کا اپنے علم و فضل اور دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے کلکتے کے عمائد میں شمار ہوتا تھا ۔ عین ممکن ہے کہ غالب کی ان سے ملاقات مولوی سراج الدین احمد کے ذریعے ہوئی ہو ۔۔۔ رفتہ رفتہ مولوی کرم حسین کے غالب سے تعلقات بہت دوستانہ ہو گئے تھے ۔ مجھے یقین ہے کہ جب غالب نے گل رعنا مرتب کی ہے تو مولوی کرم حسین نے انہی ایام میں اس کی نقل حاصل کر لی ہو گی۔[۵] "

(اس موقع پر یقین کا اظہار ضروری نہ تھا۔)

مالک رام صاحب ہی کے قلم سے اس کے متن کا تعارف ملاحظہ فرمائیے :

" گل رعنا کا یہ نسخہ مکمل ہے ۔ کاغذ کا سائز ½۲۴ × ۱۴ سم ہے اور حوش ½۱۹ × ½۹ سم ہے ۔ کاغذ باریک ولایتی ہلکے بادامی رنگ کا ہے ۔ کہیں کہیں کرم خوردگی کے آثار ملتے ہیں ۔ لیکن اس سے نہ کتاب کو کوئی نقصان پہنچا ہے نہ متن ہی کا کوئی حصہ ضائع ہوا ہے ۔ پوری کتاب کی نظم و نثر ایک ہاتھ میں سیاہ روشنائی سے نستعلیق خط میں لکھی گئی ہے ۔ کاتب کو اگرچہ بہت خوش خط تو نہیں کہا جا سکتا لیکن بدخط بھی نہیں ہے ۔ غلطی بھی کم کرتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہر جگہ تخلص، عنوان، ولہ وغیرہ الفاظ شنجرفی روشنائی سے لکھے

---

[۵] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو گل رعنا مرتبہ مالک رام، مقدمہ ص ۱۵ تا ۱۸

Scanned with CamScanner

ہیں۔ ہر ایک حصے پر دو جدولیں ہیں۔ باہری جدول صفحے کے کنارے
سے کچھ ہی اندر کی طرف ابھرے نیلے خط کی ہے۔ اس سے تین سم اندر
حوض کے عین اردگرد جدول تین خطوں پر مشتمل ہے۔ باہر نیلا خط
ہے اور اندر کی طرف شنجرفی رنگ کے دو خط۔ غزلوں کے درمیان
کے خطوط بھی شنجرفی ہیں..... ہر ایک صفحے پر تیرہ سطریں ہیں صفحہ
ایک خالی ہے... پوری کتاب ۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔
ص ا سے فارسی دیباچہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے عنوان میں صرف
یہ لفظ لکھے ہیں: لاموثر فی الموجود الا اللہ
ص ۸ سے اُردو حصۂ انتخاب شروع ہوتا ہے اور یہ ص ۲۷ تک چلا
گیا ہے۔ آخری پانچ شعر اسی صفحے پر چھ سطروں میں درج ہیں اور
اسی کے بعد فارسی نثر اور فارسی انتخاب شروع ہو جاتا ہے...
اُردو انتخاب ۱۱۶ غزلوں سے لیا گیا ہے اور اس میں کل ۵۵۴
شعر ملتے ہیں۔[1]

اتنے ہی شعر فارسی کے بھی مالک رام صاحب نے ردیف وار درج کیے ہیں جو نسبتاً زیادہ صحیح صورت ہے۔

متن کے معروضی مطالعے کے سلسلے میں پیش آنے والے بعض اہم امور کی جانب اوپر کی سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس ضمن میں جو مثالیں پیش کی گئی ہیں ان سے کسی متن کے معروضی مطالعے کی قیاسی حدبندی مقصود نہیں بلکہ بعض اہم پہلوؤں پر توجہ دلانا پیش نظر ہے۔ سچ یہ ہے کہ ایسے امور کا احاطہ متن کی اپنی نوعیت اور مرتب متن کی تفہیمی صلاحیت اور دیدہ و دریافت پر منحصر ہے۔ بہرحال متن کے مطالعے کی اہمیت و افادیت کا جتنا تعلق متن سے کے خارجی حقائق کے مطالعے سے ہے۔ اس سے زیادہ اس کا تعلق متن کے داخلی کوائف کے مطالعے اور حقائق کی جستجو سے ہے جسے سطور بالا میں متن کے موضوعی مطالعے کا نام دیا گیا ہے۔
جیسا کہ اس سے پیشتر بھی مختصراً اشارہ کیا جا چکا ہے، موضوعی مطالعے کے اعتبار سے

---

[1] گل رعنا، مقدمہ، ص ۱۹ تا ۲۲

ہم متنی حقائق کو تین حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں :

الف : متنی مواقف

ب : متنی معارف

ج : متنی محاسن

متنی مواقف کے ذیل میں تاریخی کوائف، سوانحی حقائق جس میں سیرت نگاری کو بھی شامل سمجھنا چاہیے۔ عصری معلومات، تہذیبی ماحول اور ادبی و تنقیدی رجحانات کو رکھا جا سکتا ہے۔

متنی معارف میں متنی مصادر، متنی شواہد اور اس سے متعلق امور زیر بحث آتے ہیں جن پر معلومہ حقائق کی روشنی میں گفتگو کی جا سکتی ہے۔

متنی محاسن میں متن کی ادبی اور لسانی خوبیاں آتی ہیں۔ ادبی خوبیوں سے مراد طرز نگارش سے متعلق ایسے حقائق ہیں جو متن کے بارے میں معلومات کا ضروری حصہ ہوں۔ اس ضمن میں حسب ضرورت تراکیب تراشی، الفاظ و فقرات کی استخواں بندی اور جملوں کی ساخت کی جانب تنقیدی اشارے کیے جا سکتے ہیں۔ لسانی مطالعے میں متن کی اپنی نوعیت کے پیش نظر اس کی زبان اور لفظیات و حروف وغیرہ کا وہ تنقیدی جائزہ شامل ہے جس کی اساس لسانیاتی حقیقتوں پر ہو۔

ادبی کتب و رسائل کا اگرچہ براہ راست موضوع تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن بالواسطہ طور پر ان میں ایسے حقائق مل جاتے ہیں جو بعض تاریخی کوائف اور وقوعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ تذکروں، قدیم دواوین اور بعض دوسرے رسائل اور خطوط کے مجموعوں میں ایسے واقعات و حالات کہیں اختصار اور کہیں بعض تفصیلات کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ ان واقعات کو بغیر چھان بین یا تحقیق کے تاریخ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان سے جہاں ایک تاریخ نگار بعض وقت اہم جزئیات اور نتائج اخذ کر سکتا ہے وہاں ان کی روشنی میں بعض تخلیقات کی شانِ نزول کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور اس سے زیادہ یہ کہ ان سے اس عہد کے تمدنی مزاج کو سمجھنے اور متن کی اپنی تاریخی حیثیت کو متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ مثال کے طور پر یہاں ہم اس واقعہ کو پیش کر سکتے ہیں جسے میر نے بینوا کے ترجمے میں درج کیا ہے :

Scanned with CamScanner

"در وقت محمد شاہ بادشاہ سنکرن (کذا) نام جوہری جوتے فروشی را کشت۔ بحمایت او بلوا شد چنانچہ جوتے فروشان در جامع مسجد مانع خطبہ گشتند۔ ظفر خاں روشن الدولہ کہ بطرہ باز شہرت دارد جوہری مذکور را پناہ داد۔ آخر ہنگامہ برپا شد و جنگ عظیم درمیان امرایانِ (کذا) عظام افتاد۔ بسیار از طرفین بقتل رسیدند۔ ظفر علی خان تاب نیاورد و گریخت۔ ازیں سانحہ این قسم خفت کشید کہ از آن باز از خانہ بدر نیامد این قصہ را شاعر مسطور در مخمس بست کہ ہنوز بر السنہ مذکور است۔[1]"

اس سے نہ صرف یہ کہ مخمس کہ شانِ نزول کا پتہ چلتا ہے بلکہ عہد محمد شاہ میں امرائے سلطنت کے باہمی اختلافات اور اختلالِ احوال پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔

موسوی خاں فطرت و معز کے ترجمے میں قائم نے لکھا ہے:

"روزی حضرت بادشاہ در اقتضای مہمی متردد بودند۔ صورتِ واقعہ بر سبیلِ مشورت بردند نوع بخانِ مذکور تقریر فرمودند۔ بعد تأمل بعرض اقدس رسانید کہ باعتقادِ غلام حرفِ ثانی معقول است۔ بہ استماع این کلمہ رای حضرت برنا معقول بودن سخن اولے انتقال نمودہ روی توجہ ازین بی گناہ گردانیدہ بطرفِ دیگر مشغول شدند۔ چون این عزیز بہ مغزِ سخن وارسید خجالت بسیارے کشید۔ بعد برخاست دیوان کہ بہ خانۂ خود آمد بیماری بہم رسانید۔ اطبا بموجب امر حضور بہ معالجت وی حاضر شدند۔ پس از تشخیص معلوم شد کہ زہرہ اش آب شدہ است۔ فی الجملہ آن روز را شام نکردہ کہ رو بہ مقرِ اصلی آورد۔[2]"

یہ واقعہ صرف موسوی خاں کے سانحۂ وفات ہی سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ عہد اورنگ زیب کے درباری آداب اور سطوت شاہی کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔

---

[1] نکات الشعرا، ص ۲۹

[2] مخزن نکات، ص ۲۹

ترتیبِ متن کے سلسلے میں ایسے متنی مواقف کا مناسب حدود کے ساتھ تذکرہ یا ان کی طرف ضروری اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی بعض بیانات اور تراجم سوانحی نقطۂ نظر سے بڑے اہم ہوتے ہیں اور خود صاحبِ متن کے سلسلے میں تو ان کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ قائم نے اپنے ترجمے کے ضمن میں لکھا ہے:

"ہر چند از باشندگان قصبۂ چاندپور است اما از بدوِ شعور تا این حال بہ توسل نوکری بادشاہی بہ دار الخلافہ شاہجہان آباد گذرانده ولیل و نہار بہ مقتضای مناسبت بہ صحبتِ سخن سنجانِ عالی مقدار بسر بردہ درین ایام کہ رشتۂ سلک انتظام مردم بادشاہی بہ صدمۂ انقلاب سلطنت از ہم گسیخت و ہر یکی چون لالی آب دار بر خاک مذلت افتادہ رو بہ ہر سو نہادہ چار و ناچار بلکہ بی اختیار ارادۂ سفر را بر اقامت غالب آمد[۱]"

اختصار کے باوجود اس میں موٗلف کے سوانح اور اس عہد سے متعلق اہم اشارے موجود ہیں۔

میر حسن نے اپنے ترجمے میں لکھا ہے:

"اصل این فقیر ابن غلام حسین ولد میر عزیز اللہ بن میر امامی ہروی است۔ میر امامی نور اللہ مرقدہ ہفت قلم و فاضل متبحر بودند۔ بہ سبب فضیلت در شاہ جہان آباد آمدہ بین الاقران ممتاز گردیدند۔ گاہ گاہ شعر ہم می فرمودند۔ پس این عاجز سخن را سر رشتۂ شاعری اجدادی است نہ امروزی۔ حاصل کہ از صغر سن میلان طبیعت این فقیر بہ طرف سخن بیشتر بود ۔۔۔ اصلاح سخن از میر ضیا گرفتہ ام لیکن طرز اوشان از من کما حقہ سر انجام نیافت۔ بر قدم دیگر بزرگان مثل خواجہ میر درد و میرزا رفیع سودا و میر تقی پیروی نمودم۔ شروع جوانی از گردش روزگارِ بدہنجار کہ ہرگز بہ کسی وفا نکردہ است بہ طرف لکھنؤ و فیض آباد رسیدم باری کم و بیش از قدر دانی نواب فلک جناب سالار جنگ بہادر بہ لب

---

[۱] مخزن نکات، ص ۲۰

Scanned with CamScanner

نان رسیدہ .... تا حال بہر نوع زندگانی می نمایم[۵۱]۔"

کسی متن پر تنقید کے سلسلے میں مصنف کی اپنی ذات کے علاوہ جو سوانحی مواد ملتا ہے اس پر تفصیل سے گفتگو کرنا بسا اوقات ممکن نہیں ہو سکتا لیکن بعض اہم تراجم کے ضمن میں تقابلی مطالعے کے بعد جو نئی باتیں سامنے آئیں ان کی جانب اشارہ کر دینا ضروری ہے۔

سوانحی مواد کے علاوہ اس امر پر بھی اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جا سکتی ہے کہ صاحب متن نے مختلف تراجم کے ذیل میں سیرت نگاری کے کیسے نمونے پیش کیے ہیں اور معاندانہ سیرت نگاری کی بھی کوئی صورت اس کے یہاں ملتی ہے یا نہیں مثلاً میر نے اکثر شعرا کے تراجم میں ان کی سیرت کے نمایاں پہلوؤں کو فراموش نہیں کیا اور مختصر الفاظ میں ان کی انسانی شخصیت کے خدوخال کو پیش کر دیا ہے۔ میر محتشم علی خاں کے بارے میں لکھا ہے:

"شاعر خوب فارسی و ریختہ، فہمیدہ، سنجیدہ، باہمہ بعجز و انکسار پیش می آمد۔ جنسی بود کہ در دلِ ہمہ کس جای او خالیست۔[۵۲]"

لیکن بعض ہم چشموں کی سیرت نگاری میں میر نے طنز و تعریض کے نشتروں سے بھی کام لیا ہے، چنانچہ شیخ محمد حاتم کے لیے لکھا ہے:

"مردیست جاہل و متمکن و مقطع وضع، دیر آشنا۔[۵۳]"

عصری معلومات کا دائرہ اپنے آثار و احوال کے لحاظ سے بیحد رنگا رنگ ہو سکتا ہے۔ اس رنگا رنگی کی طرف بحیثیت مجموعی ضروری اشارات بھی کیے جا سکتے ہیں اور بعض کوائف کو من و عن بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایسے کوائف کی متعدد و متنوع مثالیں ہمارے تذکروں میں مل جاتی ہیں۔ قائم نے ولی کے ترجمے میں لکھا ہے:

در سنہ چہل و چہار از جلوس عالمگیر بادشاہ ہمراہ میر ابو المعالی نام سید پسری کہ دلش فریفتۂ او بود، بہ جہان آباد آمد۔ گاہ گاہ بزبان فارسی در وصف خط و خالش می گفت۔[۵۴]"

میر نے ولی کی، شاہ سعد اللہ سے ملاقات کے ضمن میں جس کا ذکر خود قائم کے یہاں بھی

---

۵۱ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۵۴ ۵۲ نکات الشعرا، ص ۶۳

۵۳ نکات الشعرا، ص ۷۵ ۵۴ مخزن نکات، ص ۲۲

Scanned with CamScanner

موجود ہے، ایک اہم بات یہ لکھی ہے۔

میاں صاحب فرمود این ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختۂ خود بکار ببر۔ از تو کہ محاسبہ خواہد کرد؟[۱]"

میر حسن نے فضائل علی بے قید کے ترجمے میں ان کے افسانۂ عشق کو بھی بیان کر دیا ہے:

"بایکی از بتان ہند تعشق پیدا کردہ بود۔ از گردش روزگار ہمراہ نواب عمدۃ الملک بہ الہ آباد رفت۔ از فراق محبوب چون ماہی بی آب وآہوان بی صحرا می تپید و وحشت می نمود۔ روزی از برای دل بری او نواب موصوف جمعی از اہل نشاط جمع نمود۔ وبہ آن طوائف اشارہ کرد کہ این را از ناز دلربایانہ بہ دام آرید۔ شاید کہ دل این عزیز دا شود و اندوہ و غم فراموش کند۔ غرض از آن جمع یک نازنین آمدہ ایشان را بہزار فریب و عشوہ رام کرد۔۔۔ لیکن تماشا در آن جاہست کہ چون ایشان کام دل حاصل نمودہ بہ سر زانوی آن پری رو سر گذاشتند و بہ خواب رفتند در خواب محبوبۂ اولین خود را دیدند۔[۲]"

اسی طرح انھوں نے تاباں کے ذکر میں لکھا ہے:

"تمام عالم فریفتۂ حسن او بود۔۔۔ بلکہ گرمی بازار ریختہ از آن شعلہ رو دو بالا شد۔ اکثر اشخاص این فن را وسیلہ ساختہ دخیل صحبت او می شدند۔[۳]"

عصری معلومات کے ضمن میں ایسے حقائق کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً میر نے سید عبدالولی عزلت کے ترجمے میں لکھا ہے:

"تازہ وارد ہندوستان کہ عبارت از شاہجہاں آباد است، شدہ اند۔[۴]"

عزیز اللہ کے ترجمے کے ضمن میں یہ اطلاع سامنے آتی ہے:

"غزلی گفتہ است کہ تمام ادیبا را در و ذکر کردہ است۔[۵]"

---

[۱] نکات الشعرا، ص ۹۰ [۲] تذکرۂ شعرائے اردو، ص ۱۱۸ [۳] تذکرۂ شعرائے اردو، ص ۳۵

[۴] نکات الشعرا، ص ۹۲ [۵] نکات الشعرا، ص ۱۰۳

Scanned with CamScanner

محمد یار خاکسار کے ترجمے میں اپنے تذکرے کے جواب میں اس کے تذکرے کا ذکر کیا ہے:

"علی الرغم این تذکرہ نوشتہ است بنام معشوق چہل سالۂ خود و احوال خود را اول از ہمہ نگاشتہ۔"[۵۱]

میاں کمترین کے ذکر میں "مجالس مراختہ" کا تذکرہ آیا ہے:

"گاہ گاہ در مجلس مراختہ کہ این لفظ بوزن مشاعرہ تراشیدہ اند۔۔۔۔"[۵۲]

میاں عبدالرسول نثار کے ترجمے میں لکھا ہے:

"در عصر فرخ سیر بادشاہ کہ ہنگامۂ نیکو سیر در اکبرآباد گرم شدہ بود بزرگان این با قتدار بسر می بردند۔"[۵۳]

اس طرح کے آثار و احوال اپنے اندر مطالعے کے لیے ایک سے زیادہ اہم اور دل چسپ پہلو رکھتے ہیں۔ تہذیبی ماحول کا تعلق معاشرہ اور معاشرت کے کسی ایک پہلو سے نہیں ہوتا۔ اس کا دائرہ تو قوس قزح کے دائرے کی طرح ہفت رنگ ہوتا ہے۔ اس کے حلقۂ شام و سحر میں ذہنی رویے، بے تکلف محفلیں، شعر و شعور اور علم و ادب سبھی کچھ آجاتا ہے۔ شعرا کے دواوین، نثری قصوں اور خود تذکروں میں تہذیبی کوائف ستاروں کی طرح بکھرے نظر آتے ہیں۔

کسی تصنیف میں تہذیبی ماحول کا جو عکس ملتا ہے اس کے لیے بعض باتوں کا ذکر بطور خاص بھی کیا جاسکتا ہے اور اس ماحول پر مجموعی تبصرہ بھی ممکن ہے۔ غالب نے اپنے ایک خط میں دہلی کی تہذیبی زندگی کی مختصر کہانی ان الفاظ میں پیش کی ہے:

"دہلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی، قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز بازار جامع مسجد کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔"[۵۴]

میر نے نجم الدین علی خاں سلام کے ذکر میں لکھا ہے:

"اکثر اوقات اتفاق باہم فکر شعر کردن و گپ زدن و مزاح

---

۵۱ نکات الشعراء، ص ۱۱۳   ۵۲ نکات الشعراء، ص ۱۴۷

۵۳ نکات الشعراء، ص ۱۳۵

۵۴ اردوئے معلیٰ، ص ۴۰ .

Scanned with CamScanner

نمودن می افتد۔[۱]"

فغاں کے ترجمے میں اس طرح کی باتیں آئی ہیں :

"طبع او مائل بسیار است چنانچہ ناگرمل راکہ دیوان تن و دخیل بادشاہست دگھی کی منڈی کا سانڈ گفتہ و حکیم معصوم را دربار معلّی دگاؤگجراتی) نام کردہ[۲]۔"

اس سے عہد محمد شاہی میں اور اس کے کچھ بعد تک دہلی کے لوگوں کی خوش مزاجی اور خوش باشی کا پتہ چلتا ہے۔

کسی تصنیف میں اس عہد کی معاشرت اور تہذیبی ماحول کی جو جھلکیاں یا تصویریں ملتی ہیں۔ ان کی طرف جیسا کہ اس سے پیشتر عرض کیا جا چکا ہے، حسب ضرورت بلا واسطہ طور پر بھی اشارہ کیا جا سکتا ہے اور ان پر بحیثیت مجموعی بھی گفتگو ہو سکتی ہے۔ چنانچہ میر حسن کے تذکرے میں جو تہذیبی فضا ملتی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا حبیب الرحمان خاں شیروانی نے لکھا ہے :

"طبقۂ شعرا میں کثیر حصہ ایسے کاروباری آدمیوں کا تھا جن کا معیار اخلاق بلند تھا اور جو شعر گوئی کو زندہ دلی کا سامان اور ادب کی خدمت تصوّر کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ اور کمالات انسانی میں بھی قدرت و کمال پیدا کرتے تھے۔[۳]"

فاضل مرتب نے اس ضمن میں مختلف شعرا کے تراجم سے ان اشارات و فقرات کو نقل کیا ہے جن سے صاحب ترجمہ کے افکار و کردار پر فی الجملہ روشنی پڑتی ہے۔

تذکرہ نگار ایک دوسرے کی روش فکر سے فائدہ اٹھاتے اور تذکرہ نگاری کی عمومی روایات کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ پھر بھی ایک کے بعد دوسرے تذکرے میں کچھ باتیں ایسی مل جاتی ہیں جن سے بدلتے ہوئے تہذیبی و تاریخی حالات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ بعض مرتبین تذکرہ نے ان حالات کی طرف توجہ دی ہے اور اپنے مقدموں میں ان کی طرف اشارے کیے ہیں مثلاً پروفیسر محمود شیرانی نے لکھا ہے :

---

[۱] نکات الشعراء، ص ۱۳۲   [۲] نکات الشعراء، ص ۴۷

[۳] تذکرہ میر حسن، ص ۱۴

"تذکرہ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ اگرچہ مشغلۂ شعر کے خلاف تھا۔ اور سیاست کے مطلع پر فتنہ و آشوب کی گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں احمد شاہ ابدالی کی آمد اور بعد کے سیاسی واقعات نے مغلیہ سلطنت کے شیرازہ کو درہم برہم کردیا ہے۔ دہلی ویران ہو رہی ہے اور اس کے فرزند تلاش معاش میں دربدر اور خاک بسر پریشان حال پھرتے ہیں لیکن زمانے پر جا بجا جس کو دیکھو شوق شعر میں ڈوبا ہوا ہے۔ ذکور و اناث اور عامی و عالم (غرض کوئی بھی) اس چینک سے خالی نہیں۔ مسلمان اور ہندو بلکہ فرنگی زادوں تک میں یہ ذوق سرایت کر گیا ہے۔"[۱]

اس سلسلے میں پروفیسر شیرانی نے بعض شعرا کے پیشوں کا بھی ذکر کیا ہے جس سے مختلف طبقات انام میں ادبی و شعری ذوق کی سرایت کا پتہ چلتا ہے۔ ان طبقوں کو سامنے رکھ کر اس دور کے ادبی و شعری میلان کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

کسی عہد کے ادبی مزاج اور تنقیدی معیار کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھنا مشکل ہوتا ہے اس لیے تنقید متن میں اس مطالعے کی بنیادی اہمیت ہے اور اس سے صرف نظر ممکن نہیں۔ اس سے متنی حقائق کی تفہیم میں بھی مدد ملتی ہے اور کسی تصنیف کی علمی یا ادبی حیثیت کے تعین میں بھی اس سے روشنی اور رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

اہل تذکرہ نے جگہ جگہ اپنے تنقیدی نقطۂ نظر اور صاحب ترجمہ کے بارے میں اپنے ناقدانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً میر نے میر سجّاد کی شعر گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تہ داری شعر او نمایان است ہر کہ واقف موشگافی طبع اوست می داند کہ شعر سوختۂ پیچ دارش بوئے آتش دیدہ می ماند۔"[۲]

عارف علی خاں عاجز کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"زبانش بزبان اوباشان است۔ اکثر ریختہ در بحر کبت

۱۔ مجموعۂ نغز، دیباچہ، ص ۷ ۲۔ نکات الشعرا، ص ۱۲

می گوید[۱]۔"

میر خود شاعری کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور اپنے اشعار کو کس رنگ میں پیش کرنا چاہتے ہیں، اس کا اندازہ "انداز" سے ہو سکتا ہے جس کی طرف انھوں نے ریختہ کی قسمیں گناتے ہوئے اشارہ کیا ہے:

"ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و آن محیط ہمہ صنعتہا است۔ تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائی گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادا بندی، خیال وغیرہ این ہمہ در ضمن ہمین است و فقیر ہم ازین دو تیرہ محظوظم۔"[۲]

قائم اپنے تذکرے میں جب طبقۂ دوم کے شعرا کے تراجم داخل کرتے ہیں تو تعارفی عبارت میں ایہام گوئی کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"این ستم کہ بعضی از شعرای ابتدای زمانۂ محمد شاہ باعتقاد خود تلاش لفظ تازہ و ایہام نمودہ شعر را از مرتبۂ بلاغت انداختہ تا بہ معنی چہ رسد۔ غرض ناگفتہ بہ۔"[۳]

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے (دانشکدۂ دہلی کے شایع کردہ) تذکرۂ عمدہ منتخبہ کے مقدمے میں صاحب تذکرہ کے تنقیدی نقطۂ نظر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"سرور کے مذاق شعر میں ان کے ذاتی رجحانات کے علاوہ اس دور کے اثرات کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے صحت محاورہ پر زور دیا ہے۔ غزلہائے طولانی کی مذمت کی ہے اور لکھا ہے کہ ایہام گوئی کا دور ختم ہو چکا، اور مشاعروں کی اہمیت کو واضح کیا ہے جہاں نقادانِ فن جمع ہوتے تھے اور شعر کے حُسن و قبح پر بحث کرتے تھے۔"[۴]

متنی مواقف کے ضمن میں جن امور کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ کسی ادبی یا علمی متن کے تنقیدی مطالعے میں بطور خاص اہمیت رکھتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ہر متن میں یہ تمام باتیں مل جائیں۔ تذکروں میں ان مباحث کو آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے شعری متون اور

---

۱ نکات الشعرا، ص ۸
۲ نکات الشعرا، ص ۱۰۸
۳ مخزن نکات، ص ۳۳
۴ عمدۂ منتخبہ، ص ۲۰

Scanned with CamScanner

خطوط کے مجموعوں میں بھی ان کی تلاش ممکن ہے۔ بعض تصانیف کے دیباچوں میں بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر یہ امور روشنی میں آتے ہیں۔ مثلاً "دیوان زادہ" کے دیباچہ میں حاتم نے اپنے زمانے کے مذاق شعری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"سرخیٔ غزلیات معہ سنہ بسہ قسم بقید آورد: یکی طرحی، دوم فرمایشی، سوم جوابی تا تفریق آن معلوم گردد۔"[1]

اسی کے ساتھ انھوں نے غزل کے شروع میں اس کے بحور و اوزان کو بھی درج کر دیا ہے جس سے اس زمانے کے ادبی مذاق اور شعری مزاج پر روشنی پڑتی ہے۔ حاتم نے یہ بھی لکھا ہے:

"در شعر فارسی پیرو مرزا صائب است و در ریختہ ولی را استاد می داند۔ اول کسی کہ درین فن دیوان ترتیب نمود او بود۔"[2]

اس سے قدیم اُردو شاعری پر (جہاں تک اس کا تعلق دہلی سے ہے) ولی کے شعری و ادبی اثرات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ متن کے اپنے مسائل اور جزئیات کا احاطہ محض چند عنوانات کے تحت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا تعلق بہت کچھ مرتب متن کے صوابدید پر ہے۔ اسی کے ساتھ مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اس کے اپنے کون سے مسائل اہم ہیں، کن امور پر تفصیلی یا قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو ضروری ہے اور کن پہلوؤں کی جانب محض اشارہ کر دینا کافی ہے۔

معارف متن

در اصل تنقید متن کا تحقیقی نقطۂ نظر سے سب سے اہم پہلو یہی ہے۔ اس کے ذیل میں متنی شواہد متنی مآخذ یا مصادر اور تقابلی مطالعہ جیسے امور آتے ہیں۔

متنی شواہد سے مراد وہ شہادتیں ہیں جو کسی متن کے بارے میں کسی دوسرے متن یا ماخذ میں ملتی ہیں۔ اس سے متن کے حدود، اس کے زمانۂ تالیف یا اس کے نسخ مختلفہ کے بارے میں ہمیں بنیادی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

---

[1] و [2] دیباچہ دیوان زادۂ حاتم (مخزونہ رضا لائبریری رام پور)

تذکروں میں متنی شواہد کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں، تذکروں کے علاوہ دیگر تصانیف خطوط اور دواوین، نیز سوانح عمریوں میں بھی اس طرح کے شواہد کی جستجو ممکن ہے۔ اپنے سے متعلق متنی شواہد کو صاحبانِ تالیف اپنے ترجمے کے ضمن میں پیش کر جاتے ہیں۔ کہیں دیباچے میں ان کا ذکر آجاتا ہے، کہیں کسی شعری تخلیق میں ان کا حوالہ موجود ہوتا ہے۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں جہاں خود اپنا ترجمہ قلم بند کیا ہے وہاں اپنی تصانیف کے سلسلے میں بھی کچھ ضروری معلومات فراہم کی ہیں:

"فقیر در این مدت ہفت ہشت ہزار بیت گفتہ باشد و یک ترکیب بند و یک رموز العارفین گفتہ است کہ مقبول دلہا گردیدہ۔"[۵۱]

مصحفی کا بیان ہے:

"و آنچہ درین مدت تصنیف و تالیف کردہ این است: دو دیوان فارسی، یکی در جواب مولانا نظیری نیشاپوری و یکی بطور خود و سہ دیوان ہندی و دو تذکرہ فارسی و ہندی و یک دو جزو شاہنامہ تا نسب نامہ حضرت شاہ عالم بہادر و یک دیوان ہندی کہ در شاہجہاں آباد گفتہ مع مسودہ دیوان فارسی اول کہ زبان آن بطور جلال، واسیر و ناصر علی بود بدزدی رفتہ۔"[۵۲]

اس طرح کی معلومات اہل تذکرہ نے اپنے احباب، اپنے اعزہ اور دیگر معاصرین سے متعلق بھی بہم پہنچائی ہیں۔ میر نے محمد حسین کلیم کے ترجمے میں لکھا ہے:

"صاحب دیوان قصائد و مخمس و رباعی۔"[۵۳]

جعفر علی خاں زکی کے بارے میں لکھا ہے:

"بادشاہ محمد شاہ بر او فرمائشی مثنوی حقہ کردہ بود۔ دو سہ شعر موزوں کرد، دیگر سر انجام از و نیافت۔ اکنون شیخ محمد حاتم کہ نوشتہ آمد، باتمام رسانید۔"[۵۴]

---

۵۱ تذکرۂ شعرائے اردو، ص ۵۲ ۵۲ تذکرہ ہندی، ص ۲۴۸

۵۳ نکات الشعرا، ص ۴۲ ۵۴ نکات الشعرا، ص ۱۳۶

Scanned with CamScanner

میر حسن نے میر مذکور یعنی محمد حسین المتخلص بہ کلیم کے ترجمے میں لکھا ہے :

" رسالہ در عروض و قافیۂ ہندی تصنیف نمودہ وفصوص راکہ کتاب عربی است بہ زبان ریختہ ترجمہ کردہ۔ کتابی در نثر ہندی نیز ایجاد نمودہ ۔"[1]

صاحب مخزنِ نکات نے یکرنگ کے بارے میں لکھا ہے :

" ابیات دیوانش ہمگی وتمامی قریب پانصد شعر خواہد بود۔"[2]

حاتم نے اپنے دیوان اور اس کے انتخاب کے متعلق اپنے دیباچۂ دیوان زادہ میں وضاحتیں کی ہیں :

" فقیر دیوان قدیم از بست وپنج سال در بلاد ہند مشہور دارد . . . ہر رطب و یابس کہ از زبان این بی زبان آمدہ بود داخل دیوان قدیم نمودہ وکلّیات مرتب ساختہ بہ فرمایش یاران نازک طبعان از فکر قدیم وجدید کہ از مذاق ماضی وحال از وخبری دہد از ہر ردیف دو سہ غزلی و از ہر غزلی دو سہ بیتی داری مناقب ومرثیہ ومخمس و مثنوی وغیرہ موقوف داشتہ . . . . بطریق اختصار سواد بیاض نمودہ بہ دیوان زادہ مخاطب ساختہ ۔"[3]

حاتم کے اس دیوان سے متعلق لچھمی نرائن شفیق کے تذکرے میں یہ ذکر موجود ہے :

" بوقت تحریر این چند ابیات دیوانی ضخیم از و بدست آمد ۔"[4]

جس کے یہ معنی ہیں کہ شفیق کے پیشِ نظر دیوانِ قدیم تھا ۔

متنی شواہد دوسری طرح کے متون میں بھی مل جاتے ہیں

متنی معارف کا دوسرا اہم حصہ متنی مآخذ ہیں۔ تنقید متن کے ضمن میں جس پر گفتگو ضروری ہے ۔ کبھی متنی مآخذ کی نشان دہی واضح طور پر کتاب کے دیباچے یا سبب تالیف کے ضمن میں

---

[1] تذکرۂ شعرائے اُردو، ص ۱۲۸ [2] مخزن نکات، ص ۴۲

[3] دیباچۂ دیوان زادہ حاتم (مخزونہ رضا لائبریری رامپور)

[4] چمنستان شعرا، ص ۱۲۴

Scanned with CamScanner

ہو جاتی ہے۔ کبھی متن میں اس کے شواہد موجود ہوتے ہیں اور کبھی اس کی طرف ذہن کی رہنمائی تقابلی مطالعے کے ذریعے ہوتی ہے جو تحقیق متن کا حصہ ہے۔

پہلی صورت کی ایک مثال لچھمی نرائن شفیق کے یہاں موجود ہے جس نے اپنے تذکرے کی بنیاد میر اور گردیزی کے تذکروں کو بنایا ہے اور اس سلسلے میں لکھا ہے :

"دراین اثنا نکات الشعرا من تصنیف میر تقی میر و تذکرۂ فتح علی خاں تازہ از ہندوستان وارد نمودہ شوری در عالم انداخت۔"[1]

اگرچہ اس موقع پر شفیق نے انھیں دو تذکروں کا ذکر کیا ہے لیکن تذکرے کے متن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حاکم لاہوری کا تذکرہ مردم دیدہ بھی اس کے مطالعے میں رہا ہے اور بعض دوسرے مصادر سے بھی اس نے استفادہ کیا ہے۔ "تذکرۂ مردم دیدہ" کا حوالہ میاں نور العین واقف کے ترجمے میں اس طور پر آیا ہے :

"با راقم سطور اخلاص دلی دارد چنانچہ تذکرۂ مردم دیدۂ شاہ عبدالحکیم حاکم کہ سہ ہزار بیت کسری زیاد است از دستخط خود رقم نمودہ براقم سطور عنایت فرمود۔"[2]

میر نے اپنے تذکرے کے سلسلے میں اس کا بالکل اقرار نہیں کیا کہ ان کی رہنمائی کسی دوسرے وسیلے سے ہوئی ہے، لیکن دکنی شعرا کے تراجم انھوں نے عبدالولی عزلت کی بیاض کے مطالعے اور اور ان سے زبانی استفادے کے ساتھ لکھے ہیں۔ اس کا اندازہ خود ان کے تراجم سے ہو جاتا ہے۔ حبیب تخلص کے ترجمے میں انھوں نے لکھا ہے :

"از بیاض سید صاحب مذکور نوشتہ شدہ۔"[3]

مرزا داؤد کے ترجمے میں ان کی زبانی جو کچھ تحقیق ہوا اس کا اظہار کیا ہے :

"این قدر ہم از زبانی سید صاحب بہ تحقیق رسیدہ۔"[4]

عمدۂ منتخبہ کے مآخذ کے سلسلے میں اس کے فاضل مقدمہ نگار پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے لکھا ہے :

---

[1] چمنستان شعرا، ص ۳ — [2] چمنستان شعرا، ص ۱۱۴
[3] نکات الشعرا، ص ۱۰۳ — [4] نکات الشعرا، ص ۱۰۵

"سرور نے میر، میر حسن، مصحفی، لطف اور ذکا کے تذکروں کا ذکر کیا ہے
اور اس کا قرینہ غالب ہے کہ ان سے فائدہ اٹھایا ہو۔"[۱]

لیکن جب کسی متن میں اس کے مآخذ کے سلسلے میں ایسے ضمنی حوالے بھی موجود نہ ہوں یا ان کی طرف اشارہ نہ کیا جائے تو مآخذ کا پتہ چلانے کے لیے تحقیقی اور تقابلی مطالعے سے کام لینا ہوتا ہے اور بات تنقید متن کے دائرے سے نکل کر تحقیق متن کے دائرے میں آجاتی ہے جس پر گفتگو کی نوعیت دوسری ہوتی ہے۔ خطوط اور دواوین جیسے ادبی متون میں مآخذ کی بات اس طور پر نہیں کی جاسکتی۔ وہاں ان کے تخلیقی سرچشموں کی کھوج کی جاسکتی ہے جو دراصل نفسیاتی مطالعے کا موضوع ہے۔ لیکن بہت سے دواوین میں تراجم، تلخیص یا تضمین وغیرہ ایسی صورتیں موجود ہوتی ہیں جو قدرے مختلف نوعیت کے ساتھ متنی مآخذ کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔

متنی محاسن تنقیدی متن کی تیسری شق ہے۔ اس میں سب سے پہلی بات متن کا ادبی اسلوب ہے جس کا ذکر تنقید متن میں آسکتا ہے۔ ایسے مواقع پر متنی تنقید کی نوعیت حقائق متن کی جانب واضح اشاروں سے زیادہ نہیں ہوتی اور متنی نقاد اس کے حسن و قبح پر کوئی رائے نہیں دیتا۔ بحیثیت متن اس کے لیے سادہ و پیچیدہ عبارت کی اہمیت یکساں ہے بشرطیکہ اس کی قرأت ممکن ہو اور کہیں سے متن ضائع نہ ہو گیا ہو۔ مثلاً میر کے تذکرے کی زبان پر گفتگو اس انداز میں ممکن ہے۔ اس تذکرے کی زبان سادہ و سلیس ہے اور بیشتر مقامات پر عبارت ہر طرح کے جھول جھال اور پیچ و خم سے آزاد ہے۔ لیکن کہیں کہیں میر نے بھی قدیم انداز عبارت آرائی سے کام لیا ہے جس کا ایک نمونہ ہم ذیل کی عبارت کو قرار دے سکتے ہیں (یہ خواجہ میر درد کے ترجمے سے لی گئی ہے):

"جوش بہار گلستان سخن، عندلیب خوان چمن این فن، زبان گفتگوش
گرہ کشای زلف شام مدعا، مصرعۂ نوشتہ اش بر صفحۂ کاغذ از کاکل صبح
خوشہ نما، طبع سخن پرداز او سرو مائل چمنستان انداز است۔"[۲]

بعض مؤلفین اپنے انداز نگارش یا اسلوب گفتار کے متعلق خود بھی کبھی ادعا، کبھی اظہار عجز اور کبھی حقیقت حال کی جانب اشارے کے طور پر کچھ نہ کچھ لکھ جاتے ہیں۔ مثلاً فضلی نے کربل کتھا کے سبب تالیف کے ضمن میں لکھا ہے:

---

[۱] عمدۂ منتخبہ، ص ۲۱ [۲] نکات الشعرا، ص ۴۹۔

"بندۂ حقیر، پُر تقصیر حسب الارشاد اوس قبلہ گاہ کہ خاص روضۃ الشہدا کا.... سوناتا تھا لیکن معانی اوس کے نسار و عورات کی سمجھ میں نہ آتے تھے اور فقرات پُر سوز و گداز اوس کتاب مذکورہ کے بسبب لغات فارسی اون کوں نہ رولاتے تھے۔ اکثر اوقات بعد کتاب خوانی کے سب یہ مذکور کرتے کہ صد حیف و صد ہزار افسوس جو ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے بے نصیب رہتے۔ ایسا کوئی صاحب شعور ہووے کہ کسی طرح من و عن ہمیں سمجھاوے اور ہم بے سمجھوں کو سمجھا کر رلاوے۔ مجھ احقر کی خاطر میں گزرا کہ اگر ترجمہ اس کتاب کا برنگینیٔ عبارت و حسن استعارات ہندی قریب الفہم عامۂ مومنین و مومنات کیجیے...." [1]

اس سے ظاہر ہے کہ بہ تقاضۂ ضرورت مترجم بات کو من و عن سمجھانا اور ایسی عبارت لکھنا چاہتا تھا جو قریب الفہم عامۂ مومنین و مومنات ہو لیکن رنگینیٔ عبارت اور حسن استعارات کے ساتھ۔

غرض تنقید متن کے ضمن میں ایک مرتب متن کے لیے اس پر اظہار خیال مناسب حدود کے ساتھ ضروری ہوتا ہے کہ متن میں کس طرح یا کس کس طرح کا انداز نگارش ملتا ہے۔ غالبؔ نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

"مرزا صاحب، میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔" [2]

لیکن مرزا غالب کے تمام خطوط میں یہ انداز نگارش موجود نہیں۔ کہیں کہیں تو القاب و آداب میں بھی وہ تمام تکلفات برتے گئے ہیں جن سے ابا کا دعویٰ خود ان کے یہاں اور ان سے زیادہ ان کے بعض نقادوں کے یہاں نظر آتا ہے۔

قدیم تحریروں میں تنقید متن کا سب سے اہم پہلو یا دوسرے الفاظ میں متنی محاسن پر گفتگو کا اساسی مسئلہ لسانیاتی مطالعہ ہے۔ لسانیاتی مطالعے کے اپنے کچھ اصول و ضوابط ہیں لیکن

---

[1] کربل کتھا مرتبہ مالک رام و مختار الدین احمد، دیباچہ، ص ۳، ۴ و ۳۸ [2] اُردوے معلی، ص ۳۴

قدیم زبان کو جاننا اس کی بنیادی شرط ہے۔ لسانیاتی مطالعے میں املائی خصوصیات کو بھی داخل سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کہ املا زبان کے چلن، تلفظ اور صوتیاتی حقائق کی طرف اشارہ کرتا ہے ہماری زبان میں جو دوررس اور تیز رفتار تبدیلیاں زمانہ بہ زمانہ ہوتی رہی ہیں قدیم متون سے ان کی نشان دہی ہوتی ہے اور اس عہد کی زبان کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ علاوہ بریں لسانیات کے وسیلے سے ادب کے رشتے سماجیات اور تاریخ سے استوار ہوتے ہیں۔ اس لیے اس مطالعے کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ خود کسی تصنیف کے اپنے زمانے کے تعین میں لسانی مطالعے سے بڑی مدد ملتی ہے۔ بالعموم اہلِ تصنیف نے اپنی یا اپنے زمانے کی لسانی خصوصیات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی لیکن اُردو شاعری کی تاریخ میں ایک ایسی مثال موجود ہے جہاں خود مصنّف نے لسانی اعتبار سے اپنی زبان کے بعض پہلوؤں پر گفتگو کی ہے۔ یہ مثال شاہ حاتم کے (دیوان زادہ) میں سامنے آتی ہے جس کے مختصر دیباچے میں مصنّف نے اس کا اظہار کیا ہے :

"... و لفظ (در) و (بر) و (از) و (او) کہ فعل و حرف باشد ..... بندہ در دیوان قدیم خود تقید دارد و دریں ولا از دہ دوازہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ لسان عربی و زبان فارسی کہ قریب الفہم وکثیر الاستعمال باشد و روزمرہ دہلی کہ میرزایان ہند و فصیحان رند در محاورہ (؟) دارند منظور داشتہ زبان ہر دیار تا بہ ہندوی کہ آن را بھاکھا گویند موقوف کردہ محض روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند بود اختیار نمود۔ شمۂ از آن الفاظ کہ تقید دارد بہ بیان می آرد چنانچہ عربی و فارسی مثلاً تسبیح را تسبی و صحیح را صحی و بیگانہ را بگانہ و دیوانہ را دوانہ و مانند آن بطور عامہ ؛ یا متحرک را ساکن و ساکن را متحرک، چنانچہ مَرَض را مَرْض و غرض را غرض و مانند آن ؛ یا الفاظ ہندی کہ نین و جگ و نت وغیرہ آنچہ باشد ؛ یا لفظ (مار) و (موا) و ازیں قبیل کہ بر خود قباحتی لازم آید ؛ یا بجای سے ستی، یا اُدھر را ودھر و کدھر را کیدھر کہ در آن زیادتی حرف باشد ؛ یا بجای پر پہ یا یہاں را یاں و وہاں را واں کہ در مخرج تنگ بود ؛ یا کسر و فتح و ضم در قافیہ ؛ یا قافیۂ رای فارسی با رای ہندی چنانچہ گھوڑا و بورا و ھڑو سر و مانند آن ؛

و ہای ہوز را بدل کردن بہ الف کہ از عام تا خاص در مہاورہ (؟)
دارند۔ بندہ درین امر بمتابعت جمہور مجبور است چنانچہ (بندہ)
را (بندا) و (پردہ) را (پردا) وآنچہ ازیں قبیل باشد واین قاعدہ
را تا کجا شرح دہد۔"[1]

اگرچہ ان حقائق کی طرف حاتم نے اپنے زمانے کے ادبی معیاروں کے پیش نظر اشارے کیے ہیں لیکن دیکھا جائے تو یہ لسانی مسائل ہیں۔

میر نے اپنے زمانے کے ادبی و شعری معیار کے سلسلے میں ریختے کی جو قسمیں گنائی ہیں اس سے بعض لسانی حقائق کی جانب ذہن کی رہنمائی ہوتی ہے:

"اول آنکہ یک مصرعش فارسی و یک ہندی۔۔۔؛ دوم اینکہ نصف
مصرعش ہندی و نصف فارسی؛ سیوم آنکہ حرف و فعل فارسی بکار
می برند و این قبیح است؛ چہارم آنکہ ترکیب فارسی می آرند۔۔۔۔۔
و ترکیبی کہ نامانوس ریختہ باشد آن معیوب است۔"[2]

شعرا کے دواوین میں بھی بعض لسانی حقائق کی طرف اشارے مل جاتے ہیں۔ ان کو سامنے رکھ کر ان پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ خود لسانی مطالعے کی حدیں کافی وسیع ہیں۔ اس کے دائرے میں اسم فعل، حروف ضمائر، تذکیر و تانیث، جمع بنانے کے طریقے غرض کہ زبان کے بنیادی ڈھانچے کو سمجھنے سے متعلق تمام ضروری امور آجاتے ہیں جن کا اس متن کی اپنی نوعیت اور ادبی، لسانی اور لغوی ضروریات کے پیش نظر مناسب حدود کے ساتھ مطالعہ ضروری ہے۔

---

[1] دیباچہ دیوان زادۂ حاتم [مخزونہ رضا لائبریری۔ رامپور]

[2] نکات الشعرا، خاتمہ، ص ۱۷۹

Scanned with CamScanner